میخانۂ حرف

تاباں نقوی امروہوی

میخانہ تہ حرف

در تہِ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ ای
تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

مرزا غالب کے فارسی کلام کی جمالیات بزبانِ اُردو

تاباں نقوی امروہوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

سن اشاعت	:	۱۹۹۶ء
قیمت	:	ساٹھ روپے Rs. 60/-
اہتمام	:	شاہد ماہلی
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	شیخ محمد احمد 'ایوان غالب
طباعت	:	عزیز پرنٹنگ پریس۔ دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ 'ایوانِ غالب مارگ 'نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

پیش لفظ

مرزا غالب پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس کے نتیجے میں غالب کی زندگی اور ان کے فکر و فن کے گوناگوں پہلو منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنے میں تامل نہیں کہ غالب کے منظوم و منثور فارسی کلام کا مطالعہ اس انداز سے ہونا ابھی باقی ہے جس کا یہ مستحق ہے۔ ''میخانۂ حرف،، میں تاباں نقوی امروہوی صاحب نے خود ان کے بقول ''مرزا غالب کے فارسی کلام کی جمالیات بہ زبانِ اُردو،، پیش کی ہے۔ نقوی صاحب کا یہ مطالعہ غالب کے فارسی کلام پر منحصر ہے اس وجہ سے ہم اسے غالب کے فارسی کلام کے ایک پہلو کا مطالعہ قرار دے سکتے ہیں' جو غالب شناسوں کی تحسین کا مستحق قرار پانا چاہئے۔

غالب دہلوی کا فارسی کلام در حقیقت فارسی زبان و ادب کی بارہ تیرہ سو سالہ شاندار اور وسیع روایات کا امین ہے۔ ان روایات کے ادراک کے بغیر غالب کے فارسی کلام کی

اہمیت سے واقفیت نامکمل رہے گی۔ تاہم نقوی صاحب نے پیش نظر کتاب میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ نقوی صاحب کی اس کتاب میں چار ابواب ہیں۔

پہلے باب میں غالب اور اُن کے فارسی کلام سے متعلق فارسی کے غیر ہندوستانی (ایرانی اور تاجیکی) دانشوروں کی غالب اور اُن کے کلام کے بارے میں آرا کو پیش اور اُن پر مناسب تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ ادھر چند سالوں سے ایران میں غالب پر توجہ کی جارہی ہے۔ وہاں کے فارسی اساتذہ اور دیگر ادبا وفضلا غالب کے فارسی کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کے نتائج ادبی مجلّوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آیند تبدیلی ہے جس کا ہمیں خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں ایک بات عرض کرنی ضروری ہے۔ ہم نے غالب کا فارسی کلام ابھی تک تحقیق و تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کر کے شائع نہیں کیا ہے۔ یہ ایک افسوسناک صورت حال ہے۔ غالب کا مکمل فارسی دیوان جو برسوں پہلے شائع ہوا تھا، اب مشکل سے دستیاب ہے۔ غالب کے فارسی کلام کو تحقیق، تدوین اور اشاعت کے اعلیٰ معیار پر شائع کرنا غالب انسٹی ٹیوٹ کا بنیادی فرض ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس طرح غالب کے اس 'الہامی' کلام کے سنجیدہ مطالعہ میں آسانی ہو سکے گی۔

کتاب کے دوسرے باب میں غالب کے فارسی زبان وادب سے تعلق خاطر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا۔ ان کے فارسی کلام کی گوناگوں خصوصیات کے پیش نظر، فارسی سے ان کے ذہنی لگاؤ اور اس کی شاندار ادبی روایات سے ان کی آگہی پر ان کا ناز اور فخر کرنا بے جا نہیں تھا۔

نقوی صاحب نے تیسرے باب میں غالب کے قدیم فارسی شعرا اور ادبا کے ذہنی رشتے سے بحث کی ہے۔ فیضی، عرفی، طالب آملی، ابوطالب کلیم، چندر بھان برہمن، سرمد، صائب اور بیدل سے غالب نے جس انداز سے استفادہ کیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ غالب کے فن شاعری اور اس کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے کے لئے فارسی

کے ان استادان فن کے کلام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہی وہ سرچشمے ہیں جہاں سے غالب کے فن شاعری نے اپنی پیاس بجھائی ہے اور پھر انہیں نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

چوتھا باب دراصل اس کتاب کی جان ہے۔ اس میں غالب کے فارسی کلام کی جمالیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نقوی صاحب نے اِس باب میں غالب کی فارسی غزلیات، رباعیات، قطعات، مثنویات، قصاید وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کے اس حصےؔ میں جو ادبی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، ان پر روشنی ڈالی ہے اور غالب کے تخلیقی ذہن نے جو گل کھلائے ہیں 'ان کی نشاندھی کی ہے۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے جو قارئین کو پسند آئے گا۔ یہ غالبؔ کے فارسی کلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی طرف ایک قدم ہے۔ امید ہے کہ اس پہلو پر ہمارے دوسرے غالب شناس بھی قلم اٹھائیں گے اور اس طرح غالب کے "نقش ھائی رنگ رنگ" کی تفسیر کریں گے۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی

شعبہ فارسی

دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

فہرست مضامین

حرف آغاز

سخن ہائے گفتنی

عقیدت مندان غالبؔ سے معذرت کے ساتھ

مرزا غالبؔ نے خود اپنے اردو کلام کو "برگ دژم،، (برگ پژمردہ) اور بجنوری نے الہامی صحیفہ قرار دیا ہے بجنوری کا عرفان غالب بعید از حقیقت تو نہ تھا لیکن اس اعلان واعتراف سے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا صرف اردو کلام ہی الہامی ہے فارسی کلام کو یہ مرتبہ اور شرف حاصل نہیں ؟ مرزا نے تو خود بھی اپنے فارسی کلام کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

شعرِ غالبؔ نبود وحی و نگوییم ولے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

شعر غالب وحی تو نہیں لیکن کیا اسے الہامی بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ فارسی کلام کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے اس سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ارباب ادب کی نظر میں فارسی کلام مرتبۂ الہام سے فروتر ہے۔

معلوم نہیں عارف خان غالبؔ کا پیمانۂ عرفان کیا ہے؟ شاعر ایک، اس کا احساس و ادراک ایک، ذریعۂ ابلاغ دو زبانیں 'اردو کلام سرچشمۂ عرفان و آگہی' فارسی کلام "نظرے خوش گزرے،، سے بھی محروم۔ مرزا کا مشورہ ؎

فارسی بیں تا بہ یابنی نقش ہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

فارسی کلام دیکھو جو نقش ہائے رنگ رنگ سے آراستہ ہے مجموعۂ اُردو نظر انداز کرو

کہ وہ میرا بے رنگ مجموعہ ہے ؎

نیست نقصان یک دو جزو است از سوادِ ریختہ
کان دژم برگے ز نخلستانِ فرہنگ من است

اگر دیوان ریختہ دو جزو کے بقدر ہے تو کوئی نقصان نہیں کہ وہ تو میرے نخلستان فرہنگ کا ایک برگ خشک ہے۔ شاعر کے مشورہ کے باوجود مرتبہ شناسان غالبؔ بضد کہ اردو کلام "ہمہ حسن و ہمہ رنگ،، اور نقش ہاے رنگ رنگ سراسر بے رنگ، اردو کلام مسلسل مطالعہ کے لئے میز کی زینت 'فارسی کلام اہل علم کی الماریوں میں دیمک کی غذا، اردو کلام کا مرتبہ و مقام مرزا کی نظر میں کم نہیں تھا کہ وہ بھی ان کا شاہکار فکر و نظر ہے ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

یہ تضاد کیسا؟ اردو کلام بیک وقت "برگ دژم،، بھی اور "رشک فارسی،، بھی۔ لیکن فی الواقع یہ تضاد نہیں محل استعمال کے مطابق تنقید اور تمجید کا فرق ہے۔ تنقیص اس

حریف کے ادعائے تفاخر کے جواب میں جس کا ذکر اس قطعہ کے اولین شعر میں ہے۔

اے کہ در بزم شہنشاہِ سخن رس گفتہ

کے بہ پرگوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است

اور حرف تمہید بطور اعتراف حقیقت کہ اردو کلام مقام و محل کے اعتبار سے کہیں کہیں "رشک فارسی،، بھی ہے۔ ارباب اردو کی اردو کلام سے سحر زدگی برحق' کوئی کافر بھی اردو کلام کی غیر معمولی اثر آفرینی کا منکر نہیں ہو سکتا' اردو والوں کی فارسی کلام سے بے تعلقی بھی قابل تسلیم کہ ملک کا فارسی زبان سے رشتہ ٹوٹے کم و بیش ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزر چکا لیکن سوال اس افسوسناک بے تعلقی کا ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں سے بصورت ترجمہ اردو کا ربط قائم ہے۔ لیکن فارسی زبان سے تعلق یکسر منقطع ہے۔ فارسی کے بغیر اردو کا کوئی حسن نہیں' فارسی الفاظ' اس کی تراکیب' اس کا انداز فکر اردو کے تخلیقی وجود کا قابل قدر حصہ ہے۔ فارسی نے اردو کو دولت علم سے مالا مال کیا ہے' اسلوب و ادا کی دلکشی بخشی ہے' ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ کے آداب سکھائے ہیں۔ فارسی کی معنویت ہی سے اردو کی معنویت کا ایوان بلند تعمیر ہوا ہے فارسی زبان ہی سے اردو شاعری میں بہترین فکری امکانات رو بعمل آئے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ فارسی کلام کی فکر افروز معنویت سے اردو کے معیار کو مزید بلند کیا جائے اور اسے مزید جلا دی جائے۔ اندیشہ یہ ہے کہ اگر مکتب اور اسکول کی سطح تک فارسی زبان سے اردو کا رابطہ برقرار نہ رہا' تو اردو زبان دانشوران اردو کی سطح تک تو محفوظ رہے گی لیکن یونیورسٹی کی سطح تک اردو کے طلبا اردو زبان کی لسانی نزاکتوں سے بہرہ ور نہ ہو سکیں گے۔ ارباب ادب کی ذمہ داری ہے کہ اس کا حل تلاش کریں اور امکانی حد تک غالب کے فارسی کلام کی جمالیات سے اردو داں طبقے کو روشناس کرائیں کہ مرزا کا فارسی کلام بھی اس ملک کی میراث ہے بقول غالب اس میں "بادۂ عرفی" اور "رفتار ثنائی" کا بھی حسن ہے انکے نزدیک دھلی اور آگرہ اس ملک کے شیراز و اصفہان ہیں۔

بادۂ عرفی و رفتار سنائی دارم
دھلی و آگرہ شیراز و صفاہان من است

مرزا نے متعدد اشعار میں معاصرین کی تلخ و تند تنقیدوں سے متاثر ہو کر اصفہان اور شیراز جانے کی تمنا کی ہے لیکن فی الحقیقت وہ دھلی اور آگرہ کو شیراز و صفاہان کا قائم مقام تصور کرتے تھے ۔

در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن

کی بات جذباتی اور ماحول کی ناسازگاری کا ردعمل ہے۔

فارسی کے بارے میں مرزا کا بین الاقوامی تصور

مرزا شاعر عصر ہی نہیں شاعر فردا بھی تھے۔ جب ملک میں فارسی کا چراغ ٹمٹمارہا تھا اور اردو کا آفتاب نصف النہار پر تھا' وہ اس وقت بھی ہجوم عام میں شامل نہ تھے۔ معاصرین ان کی فارسی سے پر چین بہ جبیں تھے لیکن مرزا نابغۂ عصر تھے' دور رس نگاہ رکھتے تھے' استقامت کے ساتھ اپنی سوچی سمجھی راہ پر گامزن تھے' ان کی نظر فارسی زبان کی بین الاقوامی حیثیت پر تھی' ایران، افغانستان، بلوچستان' وسط ایشا کی وہ ریاستیں جو حال ہی میں سوویت یونین کے جبری نظام سے آزاد ہوئی ہیں' ان کی نظر میں مغربی ممالک بھی فارسی کی علمی کتابوں سے استفادہ کرنے میں پیچھے نہ تھے "عندلیب گلشن نا آفریدہ"، کو اندازہ تھا کہ ۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

جب تک لوگ میرے دیوان سے سرمست سخن ہوں گے' اس وقت تک یہ شراب قحط طلب کی بنا پر اور زیادہ پرانی ہو چکی ہوگی (شراب جتنی زیادہ پرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ قیمتی ہوتی ہے) مرزا کی پیش گوئی ان کی زندگی میں تو پوری نہ ہوئی انہیں گھبرا کر یہ تک کہنا پڑا کہ

غالب از ہندوستاں بگریز فرصت مفت تست
در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن

لیکن آج ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ ان کے خوابوں کی تعبیر واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔ دانشوران ایران ان کے مرتبہ کا واضح طور پر اعتراف کرتے ہیں' تاجکستان میں ان کے کلام پر کار تحقیق انجام دیا جا رہا ہے۔

غالب دانشوران ایران کی نظر میں

آقاے علی اصغر حکمت کے تاثرات

آقاے علی اصغر حکمت باعتبار علم وفضل ایک بلند پایہ اسکالر تھے' دھلی میں جب پہلی بار بڑے پیانہ پر "یوم غالب،، منایا گیا وہ اس وقت دھلی میں ایران کے سفیر کبیر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ موصوف نے اس موقعہ پر نظم ونثر دونوں میں مرزا کو خراج عقیدت پیش کیا۔

غالب کہ کلام او ثاقب بود
استاد ہزار طالب و صائب بود
در ملک سخن چون اسدالٰہی کرد
بر جملہ سخنوران فروزاں غالب بود

غالب کے کلام ان کا فروزاں تھا طالب اور صائب جیسے بیشمار شعرا کے استاد تھے چونکہ انہوں نے ملک سخن میں اسدالٰہی کی۔ اس لئے تمام سخنوروں پر غالب ہوئے۔ ایک ایرانی زباندان کا یہ اقرار کہ غالب طالب و صائب جیسے بڑے ایرانی شعرا کے استاد تھے' غالب شناسی کا حرف آخر ہے۔

جامعۂ ادبی ایران کا پیغام

آقائے علی اصغر حکمت رقم طراز ہیں :-

اب جبکہ دھلی میں "یوم غالب" منایا جارہا ہے' میرے لئے یہ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ میں "جامعۂ ادبی ایران" کے احساسات پیش کروں۔ اسداللہ خاں غالب ہندوستان کے "خاتم الشعرا" تھے اور ہم ایرانیوں کے نزدیک وہ بہت گرامی اور عزیز ہیں اور دیوان غالب ایران کے زمانہ آخر کے شعرا قاآنی اور نشاط کے دیوانوں کی طرح محبوب ہے۔ دیوان غالب سے مراد "کلیات غالب فارسی" ہی ہے۔ مذکورہ پیغام کسی ایک فرد کا نہیں "جامعۂ ادبی ایران،، کا ہے جو ایک نامور علمی ادارہ ہے۔

کلام غالب آقائے داریوش کی نظر میں

آقائے داریوش ایرانی دانشور ہیں۔ انھوں نے دلیل معتبر کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ طویل عرصے تک ایران میں عرفان غالب کیوں نہ ہو سکا۔

شاید کے از علل گمنام ماندن او در بین فارسی دانان آن باشد کہ وے در تاریک ترین ادوار سیاسی ہندمی زیستہ و ہم در زمان او بود کہ آخرین فروغ استقلال آن کشور خاموش شد و بہادر شاہ ظفر بازپسین پادشاہان گورکانی بابری باسارت لشکریان انگلیسی در آمدبہ رنگون تبعید گشت و تنگی رشتہ ارتباط ہند و ایران گسیختہ شد۔

فارسی دانان ایران میں مرزا کے گمنام رہنے کے اسباب میں سے ایک سبب شاید یہ ہے کہ وہ ہندوستانی سیاست کے تاریک ترین دور میں جئے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس ملک کا آخری فروغ استقلال خاموش ہوا بہادر شاہ ظفر بادشاہان گورکانی بابری کی آخری یادگار انگریزی لشکر کے ہاتھوں اسیر ہوئے رنگون میں قید کئے گئے اس طرح ہند اور ایران کے درمیان ارتباط مکمل طور پر منقطع ہو گیا۔ مذکورہ تجزیہ تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد

یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مرزا ایران میں نام آور نہ تھے۔

مرزا کے کلام میں فلسفہ اور عرفان کا اعتراف (داریوش)

مذکورہ اسکالر داریوش نے ایک دوسری تحریر میں محاسن کلام غالبؔ کا بڑی دقت فکر سے جائزہ لیا ہے اور فنی جمالیات کے سبھی ظاہری اور باطنی گوشوں پر عالمانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے شاید ہی کسی نے اتنی مختصر عبارت میں اتنا فیصلہ کن تجزیہ پیش کیا ہو :۔

سخن غالبؔ شیرین وپر معانی و غالباً مزین و آمیختہ نکات فلسفی ود قائق عرفانی است مانند روان شناسی دقیق مسائل باطنی را تجزیہ و تحلیل می نماید و مانند فیلسوف باریک بین خلق را' بہ صبر و تحمل مصائب دعوت می کند۔ غالب پادشاہ اقلیم تشبیہات و استعارات نو ظہور است و درین زمینہ نظیر او در جہان ادب بہ دشواری یافتہ می شود خلاصہ آن کہ غالب شاعرے بود ذولسانین کہ در اردو و فارسی شعر سرودہ و در ہر دو زبان داد فصاحت و شیرین سخنی دادہ است' اشعار او با سبکی نو ظہور ولے سادہ و سہل و ممتنع سرودہ شد و از فلسفہ و عرفان چاشنی گرفتہ است بعضے غالب را "خاتم الشعراء ہند،، لقب دادہ اند و شاید زیاد از حقیقت نہ رفتہ اند قدر مسلم این است کہ او را باید در ردیف شعراء مشہور این خطہ مانند امیرؔ خسرو دہلوی و ابوالفضل' فیضیؔ و نظیریؔ نیشاپوریؔ و بیدلؔ و حزیںؔ و امثالہم دانست و صاحب مکتبی و سبک بدیع می شود

کلام غالبؔ شیرین، پر معانی، نکات فلسفہ اور دقائق عرفانی سے مزین ہے۔ وہ دقیق مسائل باطنی کا تجزیہ و تحلیل ان کی روح کو سمجھ کر کرتا ہے اور ایک فلسفی کی طرح باریک بینی سے کام لیتا ہے دنیا کو مشکلات و مصائب میں صبر و تحمل کی دعوت دیتا ہے اقلیم تشبیہات و استعارات کا بادشاہ ہے اور اس زمانہ میں اس کا مثل دنیائے ادب میں مشکل ہی سے دیکھا جا سکتا ہے مختصر یہ کہ غالب دو زبانوں کا شاعر تھا۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا اور دونوں زبانوں میں فصاحت اور شیرین سخنی کی داد دی ہے اس کے اشعار بدیع تشبیہات اور

نادر کنایات واستعارات کا نمونہ ہیں۔ ہر جگہ اس کا اسلوب نیا سادہ و سہل اور ممتنع ہے۔ اس نے فلسفے اور عرفان سے چاشنی حاصل کی ہے بعض لوگ غالبؔ کو خاتم الشعراء ہند کا لقب دیتے ہیں یہ لوگ حقیقت سے زیادہ دور نہیں گئے ہیں۔ قدر مسلم یہ ہے کہ اس کو اس خطے کے مشہور شعرا مثل امیرؔ خسرو دھلوی، ابوالفضلؔ، فیضیؔ، نظیری نیشاپوریؔ، بیدل اور حزین اور ان ہی جیسوں کی ردیف میں شمار کرنا چاہئے کہ وہ ایک مکتب فکر اور سبک بدیع کا خالق ہے۔

داریوش نے صرف ایک درجن سطور میں غالبؔ کے محاسن کلام کا خوردبینی انداز سے اتنا مکمل جائزہ لیا ہے کہ ایجاز واختصار کے باوجود کوئی گوشہ تشنہ اظہار نہیں رہا۔ اُردو میں ایسی مثالیں کم ہی دیکھی گئی ہیں لیکن ان خصوصیات کے باوجود اس نے غالب کو خسروؔ، فیضیؔ، نظیریؔ، بیدلؔ اور حزین کی صف میں شمار کر کے مطالعہ کی کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ جن معروف و مستند شعرا کا اس نے ذکر کیا ہے ان میں سے ہر ایک کسی ایک ہی صفت سے متصف ہے خسروؔ کی زبان سادہ سلیس اور کلام میں کرب عاشقی نمایاں ہے، فیضیؔ کا زور بیان اور خود اعتمادی لایق ستائش ہے، نظیریؔ کا غزل میں ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے۔ بیدلؔ فلسفے اور خود آگاہی میں اپنی مثال آپ ہے' حزیںؔ کے اسلوب وادا میں ایران کا لسانی حسن قابل توجہ ہے غالبؔ کے یہاں یہ کمی تو بہر حال ہے کہ اس کی زبان ہندوستان کی کلاسیکی فارسی ہے لیکن باقی تمام خصوصیات جو مختلف شعرا کا طرۂ امتیاز ہیں' وہ سب یکجائی طور پر مرزا کے یہاں موجود ہیں' غالبؔ کے ساتھ اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ صرف اقبالؔ ہیں جنھوں نے مرزا سے اکتساب فیض بھی کیا ہے اور اعتراف بھی کیا ہے کہ ؎

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

طہران میں فلم غالبؔ کی نمائش

فلم غالبؔ ہندوستان کی پسندیدہ ترین فلم تھی۔ بیشتر غیر ملکی سفرا نے بھی اسے دیکھا اور پسند کیا لیکن نئی دھلی میں سفارت خانہ ایران کے کونسلر آقاے مشائخ فریدنی کو وہ بطور خاص پسند تھی۔ موصوف نے طہران میں بھی اس کی نمائش کا اہتمام کیا اور فلم کا خلاصہ مع مرزا کے سوانح اور اپنے فارسی تبصرہ کے فلم کی نمائش سے قبل حاضرین میں تقسیم کیا۔ ان کا پرُ معانی اور فاضلانہ تبصرہ لایق مطالعہ ہے :۔

"اشعار فارسی غالبؔ اگرچہ تابع سبک رائج الوقت است، فصیح و دلچسپ می باشد و پرُ از نکات و تشبیہات بدیع و دقیق و آراستہ بانواع صنائع لفظی و معنوی است۔ گاہ قلم سحار او مانند قلم نقاش کیفیات وشئون مختلف زندگی بطورے مجسم می کند کہ گوئی نقاش چابک دست منظر را تابلو دادہ است، باین سبب شعر او زمام قلب خوانندہ را در دست می گیرد و او را می گرداند و ہر کجا خواہد می برد"۔

اشعار غالبؔ اگرچہ رائج الوقت اسلوب کے مطابق ہیں لیکن فصیح، دلچسپ، بدیع و دقیق نکات و تشبیہات سے پرُ اور صنائع لفظی و معنوی سے آراستہ ہیں۔ اس کا سحر کار قلم مصور کے موقلم کی طرح زندگی کی متنوع کیفیات وشئون اس طرح مجسم کرتا ہے گویا کسی نقاش چابک دست نے منظر کو بعینہ پیش کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا شعر قاری کی زمام قلب ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اسے ہر طرف دوڑاتا اور جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

غالبؔ کے تعلق سے ایرانی اور ہندوستانی ادیبوں کے درمیان دلچسپ مکالمہ

اردو کے معروف اہل قلم اختر حسین رائے پوری طہران میں یونسکو کی جانب سے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہاں ان کی ملاقات طہران یونیورسٹی کے ڈین آف لٹریچر اور محقق تاریخ ادبیات ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا سے ہوئی۔ ڈاکٹر صفا یونسکو ہی کی جانب سے

فارسی شاعری کا انتخاب "گنج سخن،، فارسی اور فرانسیسی زبانوں کی تین جلدوں میں شائع کر چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے پوری نے ان سے شکوہ کیا۔

آپ حضرات حسن دھلوی اور امیر خسرو کو تو لایق توجہ سمجھتے ہیں' قیام پاکستان کے بعد آپ نے اقبال کو بھی وہ اہمیت دی ہے جو اس سے قبل نہ دی تھی لیکن مرزا غالب کو وہ مرتبہ کیوں نہ دیا جس کا وہ مستحق تھا؟

آپ حضرات سمجھتے ہیں کہ غالب اردو زبان کا بہت بڑا شاعر تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کو اردو شاعری سے برتر سمجھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے

فارسی بیں تابیبنی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

ڈاکٹر صفا کا جواب تھا کہ انھوں نے اپنے انتخاب میں غالب کو شریک کیا ہے۔ ڈاکٹر رائے پوری نے واضح طور پر کہا کہ ایک دو صفحہ کا انتخاب مع سوانح حیات غالب کے شایان شان نہیں جبکہ نویں صدی کے غزل گو عبدالرحمٰن جامی کے بعد تقریباً تین صدی کے عرصے میں ایران نے غالب جیسا ایک بھی شاعر نہیں پیدا کیا جس کی شاعری بطور مثال پیش کی جاسکے۔ آپ کی کتاب سے ایران کی نمائندگی تو ہوگئی برصغیر ہندوپاک کی نمائندگی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر رائے پوری نے بطور تلافی مافات شعراء فارسی کا انتخاب مع سوانح "شعر فارسی در ہندوپاک،، کے نام سے طہران ہی سے شائع کیا اور اس کے بعد ہی اہل ایران کو غالب کا صحیح عرفان حاصل ہوا۔

ڈاکٹر علوی مقدم کا عرفان غالب

(اقتباس از مقالہ دانش کدہ ادبیات "مشھد یونیورسٹی" ترجمہ سید حسن عباس غالب نامہ جولائی ۱۹۹۱ء)

غالبؔ کا شمار ایران کے ان چوٹی کے شعرا میں ہونا چاہئے جن کی وجہ سے ایرانی فارسی شاعری دنیا کی عظیم شاعری سمجھی جاتی ہے' غالبؔ کو بلاشک امیر خسرو اور اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر علوی کی رائے اعتدال فکر پر مبنی نہیں اقبال کی حد تک تو بات قابل فہم ہے لیکن خسرو اور غالبؔ کے مابین تو کوئی بھی فکری مشابہت نہیں۔ خسرو بلاشبہ ساتویں صدی ہجری کے سب سے بڑے شاعر ہیں کلام پُر سوز اور اظہار و ادا پُر کشش' زبان میں ایرانیوں جیسی دلکشی' یہ اعزاز بھی انہی کے مقدر میں تھا کہ سعدی کے ممدوح ٹھہرے پھر شاعر ہی نہیں اپنے عصر کے معتبر ترین مورخ بھی اور لطف یہ کہ تاریخ کا خشک موضوع بھی شعر کی نزاکت و نفاست پر بار نہیں۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود خسرو اور غالبؔ کے درمیان جتنا زمانی بُعد ہے اتنا ہی فکری بھی ہے۔ مرزا کا فلسفیانہ انداز فکر حیات و کائنات کے اسرار و رموز کی موشگافیاں کرتا ہے انسان کو استقامت، صبر اور خود شناسی کی دعوت دیتا ہے اور زندگی کو ایک گراں قدر عطیہ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ غم دل کا قدر شناس ہے اور غم دوران کی نفی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی سراپائے بہار ہے 'خزاں کا وجود ہی نہیں' فکر کے اس بلند مقام پر خسرو کہیں نظر نہیں آتے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے چہیتے مرید ہونے کے باوجود ان کے کلام میں تصوف اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک جبکہ مرزا کے یہاں تصوف اپنی اعلیٰ اقدار کے ساتھ پوری طرح رچا بسا ہے۔ قول فیصل یہ ہے کہ دونوں میں قبل و بعد کی تقسیم عبث ہے۔ دونوں اپنے اپنے عہد کے بڑے شاعر ہیں لیکن دونوں کے درمیان کسی تقابلی مطالع کی کوئی گنجائش نہیں۔

تاجیکستان میں غالبؔ شناسی

حال ہی میں بکھر جانے والی سوویت یونین کے جبری نظام سے نجات پانے والی ریاست تاجیکستان کی علمی اور کلاسیکی زبان فارسی اور ترکی تھی ۱۹۱۷ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد روسی زبان بجبر نافذ کر دی گئی تاہم تاجیک عوام کا ربط اپنی روایتی زبان سے برقرار رہا

اور اب کہ ریاست مکمل طور پر آزاد ہے فارسی کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

ریاست کا مشہور علمی اور ادبی ادارہ "عرفان"، جو علم و ادب کو فروغ دینے میں سرگرم ہے "جشن غالب"، منا کر مرزا کو خراج عقیدت پیش کر چکا ہے۔ "منتخب آثار غالب فارسی"، ایک تحقیقی کتاب ہے جو ادارہ نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مرزا کو ریاست کے کلاسیکی ادب میں مستقل مقام حاصل ہے تاجیکستان کے علاوہ کئی دوسری ریاستوں میں بھی اپنے علوم کو فروغ دینے کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ آذربائی جان میں فارسی زبان اپنا روایتی مرتبہ اور مقام حاصل کر رہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وسط ایشیا کا وسیع علاقہ ایک بار پھر فارسی جیسی شیریں زبان کا گہوارہ بن جائے گا۔

حرف آغاز اقتباسات کی وجہ سے ایک گونہ طویل ہو گیا لیکن ان اہم اقتباسات کو یکجا کر کے پیش کرنا اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ضروری تھا کہ ایران میں غالب کو وہ مقام نہ ملا جس کا وہ مستحق تھا۔

زیر نظر کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول :۔ حرف آغاز (سخن ہائے گفتنی) جس سے مقصد کتاب پر روشنی پڑتی ہے۔

باب دوم :۔ فارسی زبان سے مرزا کا شغف اور یہ پیش بینی کہ فارسی بین الاقوامی زبان ہے اور ان کا فارسی کلام عالمی سطح پر قبول عام کی سند حاصل کرے گا اس باب میں مرزا کے چند خطوط اور مضامین ان کے سوچے سمجھے منصوبے کی وضاحت کرتے ہیں۔

باب سوم :۔ پیشرو ان غالب کے "احساس نفس"، کی جستہ جستہ جھلکیاں جنکے تقابلی مطالع سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا کا بنیادی نقطۂ فکر احساس نفس یا "عرفان نفس"، تھا اور وہ ان کے کلام میں بطور خاص اہمیت کا حامل ہے۔

باب چہارم :۔ غالب کے فارسی کلام کی خصوصی معنویت، فلسفہ غم، عرفان ذات و کائنات، مسلک صلح کل، تصوف، رنگ تغزل، شوخی فکر، دعوت صبر و استقامت، زندگی کا مزۂ بہار تصور وغیرہ۔ برف کی وہ منجمد تہیں جو مرزا کے فارسی کلام سے بے توجہی کی بنا پر سخت اور شدید

ہو چکی ہیں' اگر اس کتاب کی نرم آنچ سے کسی حد تک پگھل سکیں تو یہ مصنف کی خوش بختی ہو گی۔

باب دوم

مرزا کا فارسی زبان سے شغف

عین اس وقت جب بزم سخن میں اردو غزل سے چراغاں ہو رہا تھا میرؔ، سوداؔ، مرزا مظہر جان جاناںؔ، خواجہ میر دردؔ اور مومنؔ جیسے لوگ' جو فارسی زبان میں بھی فکر سخن کرتے تھے' عصری تقاضوں سے متاثر ہو کر اردو ہی کو ذریعۂ اظہار بنا چکے تھے۔ یہ تنہا مرزا غالبؔ تھے جنہوں نے اردو میں کم سے کم اور فارسی میں زیادہ سے زیادہ فکر سخن کی۔ اُردو دیوان دو جزو ہی کا رہا اور فارسی کلیات ساڑھے دس ہزار اشعار کو محیط ہو گیا۔ مرزا نے عصری حالات کو نظر انداز کر کے فارسی زبان کو ترجیح کیوں دی؟ اس سوال کا جواب حالی کے نزدیک حسب ذیل ہے :۔

شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اس کا دل بڑھانے والی دو چیزیں ہوتی ہیں جو خواہی نخواہی اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں اولاً ''سبق استعداد،، اور فطری قابلیت' دوسرے اس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا' اس بات کا یقین کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم اور سخن شناس موجود ہیں۔

بلاشبہ مذکورہ ہر دو اسباب نفسیات شناسی پر مبنی ہیں لیکن خود مرزا نے اس کا ایک اور جواز پیش کیا ہے جو حسب ذیل ہے :

ذوق سخن کہ ازلی آوردہ بودم' رہزنی کرد و مرا بدان فریفت کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایان است۔

ذوق سخن نے کہ ازل سے لے کر آیا ہوں' مجھے اس بات پر فریفتہ کیا کہ آئینہ شعر

کو جلا دینا اور صورت معنی دکھلانا بھی کارنمایاں ہے۔ مرزا کے نزدیک آئینہ شعر اتنا ہی گرد آلود تھا کہ اس کے ذریعہ صورت معانی دکھلانا ممکن ہی نہ تھا۔ ناچار فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا کہ صورت معنی کی نمود اس کے ذریعہ ممکن تھی۔ حالی کا تجزیہ یقیناً نفسیات پر مبنی ہے لیکن خود مرزا کا اپنا قول سند کا درجہ رکھتا ہے۔ مرزا نے یہ کارِ خیر جس زبان میں انجام دیا اسی پر ان کے نظریہ کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے کم و بیش نصف صدی تک فارسی زبان میں اپنی فکر کے چراغ روشن کئے' نت نئی تراکیب سے زبان کو حسن و دلکشی بخشی' فلسفیانہ نکات سے شاعری کو علمی وقار عطا کیا' نوع بشر کی فکری تربیت کے لئے فن کو آفاقی قدروں سے ہم آہنگ کیا' اہل ہند کو مسلک "صلح کل" اپنانے کی ترغیب دی جو ایک رہنمایانہ اور مدبرانہ کام تھا۔ بالآخر روایت سے انحراف اور افکار نو کی ترویج سے مقصد شاعری متعین ہو گیا اور آج کاروان ادب و شعر انہی راہوں پر گامزن ہے جن کی نشاندہی مرزا اپنی فارسی شاعری میں کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو ذیل کا شعر جو سند ہے؎

خشک است کشت شیوہ تحریر رفتگاں
سیرابش از نم رگ ابر قلم کنم

(تحریر رفتگان کی کھیتی خشک ہے میں اس کو اپنی زبان قلم کی نمی سے سیراب کرتا ہوں)

فارسی کی برتری کے بارے میں مرزا کا اعتراف

ذیل کے خط میں فارسی سے عشق کا کھلا اعتراف ہے: نظم و نثر فارسی کا عاشق ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں' جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر۔ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالبؔ تیرا مولد بھی ہندوستان ہے' میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے؎

ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تابنالم ہم ازان جملہ زبانم دادند

دستگاہ پارس سے بطور مال غنیمت جو کچھ لوٹ لیا گیا اس پر کب تک ماتم کروں کہ اس کے عوض مجھے زبان دے دی گئی ہے۔

مکتوب بنام نواب صاحب رامپور

بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا' چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے' بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق اور دقائق فارسی زبان کے معلوم کئے' اب مجھے اس امر میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعوی اجتہاد نہیں بحث کا طریق یاد نہیں۔

مکتوب بنام نواب علاء الدین خان

مجھے اپنے ایمان کی قسم' میں نے اپنی نظم ونثر کی داد جیسی کہ ملنی چاہئے تھی نہ پائی۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا' قلندری اور آزادگی، ایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے تھے' ہزار میں سے ایک کے بقدر ظہور میں نہ آئے۔

کشد چہ رنج سخنور کہ نقش ہائے بدیع
زبہر آنکہ گزارد بہ یادگار کشد

سخنور نقش ہائے بدیع تیار کرنے میں اس لئے تکلیف اٹھاتا ہے کہ جن کے لئے وہ نقش تیار کئے ہیں وہ انہیں یادگار سمجھیں۔

کاش مرزا کا یہ تاثر ارباب اردو کے دلوں کو چھو سکتا۔

مکتوب بنام نواب مصطفےٰ خان شیفتہ

بندہ را در زمین "گریستن" نگارش قصیدہ افتادہ بود۔ آن می خجم کہ این ورق را چون برأت نامقبول باز برم وریختہ گویان را در دسر نہ دہم' از آمدن حضرت "آزردہ" دل بخود بالید وزمزمہ دستوری یافت۔

بندہ کو زمین ”گریستن،، میں قصیدہ لکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کو برات نامقبول کی طرح واپس لے جاؤں اور ”ریختہ گویون،، کو دردسر میں مبتلانہ کروں لیکن حضرت آزردہ کے آجانے سے دل بڑھا اور قصیدہ حسب دستور پڑھا۔

یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ فارسی کلام ریختہ گویوں کے لئے دردسر ہے مرزا بے تکلف فارسی کلام کے انبار لگاتے رہے' یہ قصیدہ کی افادیت پر اعتماد کا ثبوت ہے۔

ناقدری زمانہ کا دردناک شکوہ

پنجاہ و دو سال مغز سخن کاف ختم امروز کہ شصت و ششمیں سال زعمر گریزان گزرد سخن آفرین راسپاس گزار و ہم جز آن بخشندۂ بخشائش گرنیارد دانست کہ درین پنجاہ و دو سال چہ ”درہا،، بروے من کشادہ اند و کرسی اندیشۂ مرا بہ کدام فرازستان آگہی بہ کدام پایہ نہادہ اند' حیف کہ ابنائے روزگار حسن گفتار مرانہ شناسند۔ مراخود دل بر آنان سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نہ گشتند وازین نمائش ہائے نظر فروز کہ در نظم بکار بردہ ام' سرگران گزشتند' گوئی نظیری ہمدرد من و مقطع آن مینو آرامش گاہ نوائے ساز دم من است۔

تو نظیریؔ زفلک آمدہ بودی چو مسیح

بازپس رفتی و کس قدر تو نشناخت ہنوز

باون سال مغز سخن کی پرورش کی اور اب کہ عمر گریزان کا چھیاسٹھواں سال ہے سخن آفرین کا سپاس گزار ہوں اور بخشندۂ بخشائش گر کا ایک جز بھی کوئی نہ سمجھا کہ ان باون برسوں میں کیسے کیسے در میرے سامنے کھلے اور میری کرسی اندیشہ کو فرازستان آگہی میں کتنا بلند مقام ملا' افسوس کہ ابنائے روزگار میرے حسن گفتار کو نہ پہچان سکے میرا دل جلتا ہے کہ وہ فرۂ ایزدی کے پہچاننے میں ناکام رہے اور ان نظر افروز نمائشوں سے جو میں نے اپنے کلام میں کین سرگراں گزر گئے۔ نظیری میرا ہمدرد تھا کہ اس مینو آرامشگاہ کا مقطع میرے ہی ساز دل کی آواز ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت ہنوز

تو نظیری عالم بالا سے آیا تھا واپس بھی چلا گیا۔ اور ہنوز کسی نے تیری قدر نہ پہچانی۔

ایرانی زباندان کے ساتھ دو سال

فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری اور طبعی تھا ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل سے منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا لطائف فارسی (بحت) خالص اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے' سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ذہن معوج نہ تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دلنشین خاطر ہو گئی۔

اردو مکتوب نویسی بہ سبب ناتوانی

درپارسی زبان بسا سخن گفتہ ام و سرنامہ ہا نگاشتہ اکنون کہ دل از ناتوانی سگالش بر نمی تابد کار بر خود آسان کردم و ہر چہ می باید نبشت در اردو می نویسم گوئی گفتار نامہ فرو می پیچم و بہ دوست می فرستم حاشا کہ در اردو نیز سخن نمائی و خود آرائی آئین باشد آنچہ بانزدیکان توان گفت بہ دوران نوشتہ می شود:

فارسی زبان میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں اور سرنامے بھی لکھ چکا ہوں اب کہ دل بسبب ناتوانی ساتھ نہیں دیتا میں نے کام اپنے لئے آسان کر لیا ہے جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا ہے اردو میں لکھتا ہوں گویا خط میں گفتگو تحریر کرتا ہوں اور دوست کے پاس بھیج دیتا ہوں ہر چند کہ اردو میں بھی سخن نمائی اور خود آرائی کا دستور ہے جو کچھ قربت رکھنے والوں سے کہہ سکتا ہوں وہی دور کے لوگوں کو لکھ بھیجتا ہوں۔

روایتی شاعری سے انحراف

"آہ از من کہ مرا زیاں زدۂ خرمن سوختہ آفرید ندنہ بآئین نیاگان خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ وکمر ونہ بفرہنگ فرزان گاہ پیش بو علی آسا علم وہنرے گفتم' درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازلی آوردہ بودم رہزنی کردو مرا بدان فرت فت کہ آئینہ زدودن وصورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سرل شکری ودانشوری خود نیست صورت گری بگزارو سخن گستری رو آرنا گزیر ہم چنان کردم"

افسوس کہ مجھے زیاں زدہ اور خرمن سوختہ پیدا کیا نہ سلطان سنجر جیسے میرے اپنوں کی طرح دارائی کلاہ وکمر اور فرہنگ فرزانگاہ میں بو علی جیسا علم وہنر سوچا درویشن ہو جاؤں اور آزادانہ زندگی گزاروں ذوق سخن نے جو مجھے ازل سے ملا ہے رہزنی کی اور مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ آئینہ مصفا کرنا اور صورت معنی دکھلانا بھی کار نمایاں ہے یہ کوئی سر لشکری اور اپنی دانشوری نہیں صورت گری ترک کی اور سخن گستری اپنا کرنا گزیر طور پر وہی کیا جو جلائے آئینہ کے لئے ضروری تھا۔

حرف عبرت

مذکورہ خطوط اور اردو فارسی عبارات مرزا نے خون دل سے رقم کی ہیں۔ اپنی رفعت فکر اور کلام کی معنویت کے ساتھ اس کرب کا بھی اظہار ہے کہ جو فرۂ ایزدی ان کو نصیب تھا' زمانہ نے اس کی' قدر نہ کی خود ہی لکھا اور خود ہی سمجھا' حری فان عصر کے طنز وتعریض سے عاجز آکر جو شعر کہا وہ تازیانۂ عبرت سے کم نہیں۔

زحمت احباب نتوان داد غالبؔ بیش ازین
ہرچہ می گوئیم بہر خویش می گوئیم ما

غالبؔ احباب کو اس سے زیادہ اور زحمت نہیں دی جاسکتی' ہم جو کچھ بھی کہتے ہیں اپنے لئے ہی کہتے ہیں۔

گریستن کی زمین والا قصیدہ برات نامقبول کی طرح واپس لے جانے کے سلسلہ کا یہ جملہ بھی کرب دروں کا آئینہ دار ہے:

"میں نے سوچا ریختہ گویوں کو درد سر میں مبتلا نہ کروں،،

فارسی کلام ریختہ گویوں کے لئے کل بھی درد سر تھا اور آج ڈیڑھ صدی بعد بھی درد سر ہے اور اسے وہ کم سے کم مرتبہ بھی نصیب نہیں جو دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب کو حاصل ہے۔ فاعتبرو یااولی الابصار۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

فارسی زبان سے مرزا کے عشق کا سوال مبہم رہے گا اگر اس عام غلط فہمی کا ازالہ نہ کر دیا جائے کہ فارسی زباں دانی کے باب میں مرزا معاصرین میں کسی کو بھی اپنا ہمسر نہ سمجھتے تھے اور اس خصوص میں اعتدال سے زیادہ خود پسند اور خود نما تھے۔ چند شعر جو مرزا نے اپنے مرتبہ و مقام کا حریفوں پر اظہار کرنے کے لئے بانداز خود نمائی کہے 'اس غلط فہمی کے عام ہونے کا سبب بنے۔

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گواست

یا

ہم بعالم از ہمہ عالم بر کنار افتادہ ام
چون امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

قلم مدعی اور نکتہ گواہ ہے کہ دنیا میں آج مجھ ایسا شاعر، صوفی، نجومی اور حکیم کوئی نہیں میں اس دنیا میں ہوں لیکن اس سے اس طرح علاحدہ ہوں جیسے تسبیح کے دانوں کے ساتھ امام تسبیح کا شمار نہیں کیا جاتا۔

حقائق گواہ ہیں کہ ان کے اس دعوی میں کوئی غلو نہیں تھا وہ ایسے شاعر تھے جسے

خاتم الشعراء ہند قرار دیا گیا اور ایسے صوفی بھی جس نے اپنے مسلک "صلح کل"، سے بندگان خدا کے درمیان تفریق نہ کی۔ عظیم المرتبت صوفیا کا بھی یہی شعار رہا ہے۔ نجومی ہونے کے دعوے میں بھی شک کی گنجائش نہیں' قصائد کی تشبیب میں انھوں نے اس علم سے اپنی واقفیت کا جو ثبوت دیا ہے اس پر مقالے تحریر کئے جا چکے ہیں۔ حکیم ہونا تو بہ ہمہ وجوہ مسلم ہے۔ بحیثیت فلسفیانہ فکر کے بھی حکیم اور حکیم کے رواجی معنیٰ میں بھی حکیم' اس لئے کہ انھوں نے باقاعدگی سے طب پڑھی اگر چہ مطب نہیں کیا کلام میں طبّی مصطلحات کا استعمال اور فنی وضاحت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اب یہ بات کہ اہل علم دعویٰ علمیت اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں صحیح ضرور ہے لیکن اگر کہیں سخن گسترانہ بات آ پڑی ہو تو قلم کی جنگ میں رجز خوانی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ بات کہ مرزا اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ واقعات سے اس کی تردید ہوتی ہے :۔

مرزا نے معاصرین کے حفظ مراتب کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ ذیل کے اشعار سند ہیں :۔

ہندرا خوش نفسا نند سخنور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشاں از دم شان
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ وانگاہ
حسرتیؔ اشرفؔ و آزردہ بود اعظم شان
غالبؔ سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شان

ہندوستان میں ایسے خوش نفس سخنور ہیں، جن کے انفاس سے ان کی خلوت کی ہوا مشک فشاں ہو جاتی ہے۔

مومن نیّر و صہبائی و علوی، حسرتی، اشرف و آزردہ ان میں نمایاں اور صاحب عظمت ہیں غالب سوختہ جان کا نام ان کے ساتھ شمار میں نہیں آتا کہ وہ صرف بزم سخن میں

ان لوگوں کا ہمدم وہم نفس ہے۔

چراغ سے چراغ جلنے کی بات مسلمہ ہے ہر چند کہ مرزا کے کلام کی ندرت "فکری بلند پروازی، اور اسلوب واداکی دلکشی خود ان کے ذہن کا ہی حاصل تھی لیکن انہوں نے ممتاز ارباب فن کی رہنمائی کا ذکر ادب واحترام سے کیا ہے جو انکسار اور اساتذہ کی مرتبہ شناسی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ کلیات فارسی کی خود اپنی تقریظ میں رقم طراز ہیں: شیخ علی حزین کے خندہ زیرلب، طالب آملی کی نظر، عرفی کی برق چشم، ظہوری کی بازو پر حرز بندی نے ان کو سحر نگاری پر آمادہ کیا۔ کیا یہ اس بات کا واضح ثبوت نہیں کہ مرزا اپنے پیشرو شعرا کا احترام کرتے تھے؟

باب سوم

پیشروانِ غالب کے کلام میں خود شناسی

مرزا کے کلام میں یوں تو معنوی محاسن بے شمار ہیں لیکن "احساس نفس"، اور "عرفان ذات"، کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس پر گفتگو سے قبل یہ مناسب خیال کیا گیا کہ مرزا سے پہلے جن عظیم المرتبہ شعرا نے اس موضوع پر کسی بھی عنوان سے فکر کی ہے اس کو تقابلی حیثیت سے سامنے لایا جائے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مرزا کا اپنا امتیاز کیا ہے۔ اس غرض سے چند شعراء کا کلام بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

حکیم ابوالفیض فیضی

فیضی دربار اکبری کا ملک الشعرا تھا۔ "دقیق مسائل فلسفہ"، "خود اعتمادی"، "جوش اظہار"، "بیباکی"، اور کسی حد تک تشکیک اس کے کلام کے امتیازات ہیں۔ حسن دهلوی اور خسرو سے اظہار عقیدت کرتا ہے۔ انسانی نفس کی مضمر صلاحیتوں پر اعتماد رکھتا ہے۔ حمد و نعت میں اس نے زور بیان اور جوش عقیدت کا جو ثبوت دیا ہے اس سے الزام تشکیک رفع ہو جاتا

ہے۔ اپنے بارے میں اس کا اعتماد ملاحظہ ہو ؎

عجب کہ حوصلہ روز گار برخیزد
اگر بروں فگنم انچہ در درون من است

جو کچھ میرے اندروں میں محفوظ ہے اگر میں اس کا اظہار کردوں تو کوئی تعجب نہ ہو اگر زمانہ کا حوصلہ بلند ہو جائے۔ اس کا یہ دعویٰ خود آگاہی بر حق ہے' جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ جرأت اظہار ملاحظہ ہو ؎

از نقش ونگار دو جہاں سادہ درونیم
صورت گری چین و خطارانہ شناسیم
در کشف حقائق سبق آموز ضمیریم
ترتیب دلیل حکما را نہ شناسیم

ہمارا دل دونوں جہاں کے نقش ونگار سے سادہ ہے۔ چین و خطا کی صورت گری میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں' حقائق کے انکشاف میں ہمارا ضمیر خود ہمارے لئے سبق آموز ہے حکما کی صغریٰ کبریٰ والی ترتیب ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی' خود شناس انسان کے لئے خارجی عوامل غیر اہم ہوتے ہیں' فیضی نے بڑے حسن سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ حوصلہ افزائی کے انداز میں جہد و عمل کا پیغام ملاحظہ ہو ؎

اے کہ از بادیۂ عشق خبرمی پرسی
پاے بردار کہ کونین دو گام است اینجا

مرحلۂ دشوار درپیش ہو تو کسی سے راہنمائی کا کیا سوال۔ قدم بڑھا کر دیکھ کہ کونین کی مسافت دو قدم سے زیادہ نہیں۔ اسی خیال کو مزید وضاحت سے پیش کرتا ہے ؎

ہر کس بکار مرتبۂ ارجمند یافت
فرہاد کوہ کند و مقام بلند یافت

رو از بلامتاب کہ آسودۂ وصال

کامے کہ یافت از دل مشکل پسند یافت

ہر شخص نے کوئی مرحلہ سر کر کے ہی مقام ارجمند حاصل کیا فرہاد نے کوہ کنی کی اور بلند مقام حاصل کیا تو بھی مشکلات سے منہ نہ موڑ کہ جو بھی کامیاب وکامران ہوا اس نے اپنا مقصد مشکل پسندی سے ہی حاصل کیا۔ اپنے عزم کا فخر و اعتماد سے اظہار کرتا ہے ~

نگاہ ہمت فیضی بہ سوے صید گہ است

کہ صد ہزار ہما' نیم بسمل افتاد است

فیضی کی نگاہِ ہمت صید گاہ پر ہے جہاں صد ہزار ہما نیم بسمل پڑے ہیں ~

کعبہ رو تعلیم بم آدا مکن

گرم رو را فرصت احرام نیست

کاروان کعبہ شد منزل نشیں

رہروان عشق را آرام نیست

مسافرِ حرم جا مجھے آداب تعلیم نہ کر' مجھ گرم رو کو احرام باندھنے کی فرصت کہاں ؟ کاروان کعبہ تو منزل پر پہنچ بھی گیا' لیکن رہروان عشق کے لئے کسی وقت آرام نہیں۔ ایسے ہی کچھ خیالات کی بنا پر فیضی کو تشکیک کا الزام دیا گیا لیکن پیروانِ طریقت عشق کو علانیہ اقرار توحید اور متابعت شرع سے بھی افضل سمجھتے ہیں۔ مسئلہ نزاعی ہے لیکن شاعری میں شوخی اور جرأت کو ہمیشہ آزادی حاصل رہی ہے اور عشق تو بہر حال عبادت ہی کا ایک افضل اور بلند مقام ہے۔ فیضی دربار شاہی سے وابستہ ہونے کے باوجود آزاد خیال تھا۔ اس کا فنی مقام اتنا بلند تھا کہ اس سے کوئی احتساب نہ کیا گیا اور اس کے بھائی ابوالفضل نے اسی شاہی اقتدار کے دور میں اس کا دیوان مرتب کیا۔

جمال الدین عرفی

عہد اکبری میں ہندوستان آیا۔ بڑا خوددار شاعر تھا، رفعت فکر، اولوالعزمی اور حسن ادا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ کہتا ہے۔

سینہ گرم نہ داری مطلب صحبت عشق
آتشے نیست چو در مجمر ذات عود مخر

عشق کے لئے سینہ کا گرم ہونا ضروری ہے اگر تیری انگیٹھی میں آگ ہی نہیں ہے تو عود خریدنے سے کیا حاصل؟ وہ تو آگ میں جل کر ہی خوشبو دیتا ہے۔ عرفی بھی عشق کو تمام امکانات زیست کی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتا ہے کہ یہ جب حد جنوں پہنچ جاتا ہے تو مشکلات دم توڑ دیتی ہیں۔ جذبہ عقیدت بھی جب منزل عشق طے کر لیتا ہے تو خرق عادات واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ عرفی کو شہنشاہ زمانہ کی نامور ترین شخصیت علی ابن ابی طالب سے اس درجہ عشق و عقیدت تھی کہ اس نے ایک شعر میں دعویٰ کیا۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

مجھے ہند میں ہلاک کیا جائے یا ملک تتار میں، میں گور سے نجف تک اپنی پلکوں کی کاوش سے راستہ بناتا ہوا وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس کی پیشگوئی پوری ہوگئی ایک فقیر اپنے بھائی کی قبر سمجھ کر عرفی کی ہڈیاں نکال کر نجف لے گیا اور وہاں دفن کر دیا یہ بھی فیضان عاشقی ہی ہے۔

طالب آملی

دربار جہانگیر کا ملک الشعرا تھا۔ خوش فکر اور خوشگو تھا۔ کہتا ہے۔

پس زانوے فکر مملکتے است۔

کہ زاقلیم این جہاں نبود

زانوے فکر کے تحت ایک پوری مملکت آباد ہے اور صاحب فکر کا اس پر پورا پورا اقتدار ہے۔ وہ مملکت اس اقلیم (وجود مادی) سے نہیں ہے۔ انسان اس کے ذریعہ محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اس فکر کا تعلق خود اپنی ذات کے عرفان سے ہے۔

ابو طالب کلیم

دربار شاجہان کا ملک الشعرا تھا کشمیر کے نظاروں کا عاشق تھا۔ یہی جان جان آفرین کے سپرد کی کہتا ہے۔

طبع بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے

ہاہمتے کہ از سر عالم تواں گزشت

عالم کے ساتھ ساز کرنے والا احساس پیدا کر اور ایسی ہمت کہ تو دنیا میں سربلند ہو جائے ~

در وطن خود گہر آبلۂ بیش نیست

کے بہ عزیزی رسد یوسف نفروختہ

اندرون صدف موتی ایک آبلہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یوسف بکے بغیر مرتبۂ عزیزی تک نہیں پہنچے۔ مطلب واضح ہے کہ جب تک انسان اپنے اندروں کی صلاحیت بروے کار نہیں لاتا اسے مقام امتیاز نہیں ملتا۔

چندر بھان برہمن لاہوری

شاہجہاں کے دفتر انشا سے متعلق تھا۔ امرا اور شاہزادوں کو مکتوب نویسی اور خوش خطی کی تربیت دیتا تھا۔ صاف سادہ اور موثر شعر کہتا تھا۔ تصوف سے دلچسپی رکھتا تھا۔ بنارس میں فوت ہوا۔ شعر ملاحظہ ہو ~

تو بر ساحل کجا از شورش دریا خبرداری
بغواصے سخن از قعر دریامی تواں گفتن

کنار دریا کھڑا رہ کر شورش دریا کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ یہ بات تو کسی غواص ہی سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ یہ شعر لکھ کر برہمن نے سعدی شیراز کی ہم نوائی کی ہے ؎

بدریا در منافع بے شماراست
اگر خواہی سلامت بر کناراست

نعمت خان عالی

دربار اورنگ زیب میں مقام امتیاز پر فائز تھا۔ اپنی ذہانت کے لئے مشہور تھا۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے باہمی نزاعات سے باخبر تھا۔ ذیل کے شعر میں ازرہ احتیاط کسی کا نام لئے بغیر لفظ ''قوم،، استعمال کرتا ہے۔ ممکن ہے درپردہ یہ کوئی طنز ہو۔ سامنے کے معنی تو جدوجہد کی ترغیب دینا ہی ہیں۔

قومے بہ جدوجہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالۂ تقدر فی کنند

ایک قوم جدوجہد کے ذریعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے۔ اک دوسری قوم اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کردیتی ہے۔

سرمد

یہودی الاصل تھا۔ اسلام قبول کرچکا تھا۔ حکمت وفلسفہ کے مضامین بڑی خوبصورتی سے اپنی رباعیوں میں پیش کرتا ہے۔ آزاد خیال تھا۔ ادارا شکوہ کو اس سے بڑی عقیدت تھی۔ برہنگی کے جرم میں واجب القتل ٹھہرایا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کے تذکرہ میں یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے۔ ''مذہب ہمیشہ سیاست کی آڑ میں رہا ہے،،
حقائق آگاہ تھا مگر ارباب خبر کی طرح اسرار کی پردہ پوشی نہ کرتا تھا۔ جو کچھ حق سمجھتا تھا برملا

کہتا تھا۔ رباعیوں کے علاوہ اور کسی صنف میں فکر سخن نہیں کی۔

دریاست دلت گر تو شناور بشوی

غواص محیط ہفت کشور بشوی

اگر تو شناوری کرے تو تیرا دل خود اک دریا ہے۔ اس کی گہرائی میں اتر کر تو ہفت کشور کو محیط ہو سکتا ہے۔ تیرے بحرِ وجود میں سب کچھ موجود ہے چاہے طوفان اٹھا یا شناوری کر۔

مرزا عبدالقادر بیدل

عہد اورنگ زیب کا آزادہ رو شاعر تھا۔ زندگی بھر کسی کی مدح نہ کی۔ فکر فلسفیانہ ہے اور اپنی "انا"، میں مست ہے۔ دقت پسندی کی وجہ سے اکثر اشعار مغلق ہیں۔ لیکن جو صاف و سادہ ہیں۔ معنوی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ عہد محمد شاہ میں فوت ہوا۔ رقعات اور دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ وسط ایشیائی ریاستوں میں اسے خصوصی مقام حاصل ہے جہاں اس کے کلام اور سوانح پر کارِ تحقیق انجام دیا جا رہا ہے۔ اس کا غرور بندگی ملاحظہ ہو۔

علاجے نیست داغ بندگی را

اگر ہیچم و گر کم آفریدند

اگر عالم برائے خویش پیدا است

برائے من مراہم آفریدند

داغ بندگی کا تو کوئی علاج ہی نہیں، مجھے بلند مرتبہ پیدا کیا ہو یا کم حیثیت لیکن اگر عالم خالقِ کائنات نے اپنے عرفان کے لئے خلق کیا ہے تو مجھے بھی خود میری اپنی ذات کے لئے ہی پیدا کیا ہے یہ ہے۔ بیدل کا عرفان نفس۔ ایک اور موقعہ پر حسن ادا کے ساتھ معانی آفرینی سے کام لیتا ہے۔

پے نافہ ہاے نجستہ بو مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرہ خورد و بہ ختن درآ
ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدہ ای در دل کشا بہ چمن درآ

خوشبودار نافوں کی تلاش میں زحمت کیوں؟ حلقۂ زلف محبوب کے ساتھ گرہ باندھ اور حسن کا مشاہدہ کر۔ یہ تو بڑا ستم ہے کہ تیری ہوس تجھے سرو و سمن کے نظاروں کی ترغیب دے، جبکہ تو خود کسی غنچہ سے کم نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول اور خود اپنے چمن کی سیر کر، دقیق معانی کو حسن ادا سے آراستہ کرنا بیدل کا امتیاز ہے۔ ایک خوبصورت شعر دیکھئے:۔

ساعتے چون بوے گل از قید پیراہن برآ
از تو چشم آشنائی این قدر دارد بہار

پھول کی خوشبو کی طرح لحظہ بھر کے لئے قید جسد سے باہر نکل کر تو دیکھ۔ بہار خود تجھ سے چشم آشنائی رکھنا چاہتی ہے۔ کیا خوبصورت خیال ہے اور کیا حسن ادا؟

ایک رباعی میں ذات و صفات کے مسئلہ کو حسن شعر سے آراستہ کرتا ہے۔

بیدل تا محو گلبن نیرنگیم
گاہے گل و گاہے دل تنگیم
گویند زنگہا رنگ ہا برون باید بود
دشوار حقیقتے کہ ما ہم رنگیم

بیدل اس گلبن نیرنگ میں ہم کب تک محو نظارہ رہیں کہ کبھی پھول کی طرح شگفتہ ہیں اور کبھی دل تنگ۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم رنگوں کے اس ہجوم سے باہر نکل آئیں لیکن یہ تو بڑی مشکل بات ہے کہ ہم تو خود بھی رنگ ہیں۔

صائب

دست وپائے باغ ہاں بوسیدن از دوں ہمتی است
سعی کن تا بہ کلید ایں در بروبت واشود

نظارۂ گلستان کے لئے صاحب گلستان کی دست وپابوسی دوں ہمتی کے مترادف ہے۔ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ در گلستاں بغیر کلید ہی کے کھل جائے۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

تشنہ لب بر ساحل دریاز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گماں چیں پیشانی مرا

میں غیرت کی وجہ سے دریا کے کنارے تشنہ لب رہ کر جان دے دوں اگر موج دریا کی پیشانی پر مجھے لکیریں پڑی ہوئی نظر آئیں۔

باب چہارم

محاسن کلام غالبؔ

بارگاہ الٰہی میں بےلاپیاکانہ شکوہ

گزشتہ صفحات میں ان شعراء کے کلام کا جستہ جستہ جائزہ لیا گیا جنھوں نے کبھی کبھی خود شناسی کے بھلے نظر سے فکر سخن کی۔ یہ شعراء بالعموم دربار شاہی سے وابستہ تھے اس عہد میں خود شناسی سے ان کا مطلب حصول مقصد کے لئے جدوجہد کی تلقین سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ مرزا غالب کو وہ زمانہ ملاجب مغل اقتدار ختم ہو چکا تھا اور سات سمندر پار کی ایک جارح قوم برسر اقتدار آچکی تھی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ بڑا صبر آزما تھا۔ بہادر شاہ کا سکہ لکھنے کے الزام میں معتوب اور آزوقہ حیات (پنشن) کی بحالی نئے حکمرانوں کے دست اختیار میں تھی۔ ایک اہم ضرورت کے تحت انھوں نے نئے حکمرانوں کے لئے کارمداحی ضرور اختیار کیا لیکن ان

کے اندرون کی تصویر ذیل کے الفاظ ہیں۔
گورنمنٹ کا بھانڈ تھا "بھٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا خلعت موقوف بھٹی متروک۔
کوئی خوددار اور معزز شخص شدید نفرت اور ناگواری کے بغیر اپنے لئے "بھانڈ" جیسا مکروہ لفظ
استعمال نہیں کرسکتا۔ بہر حال کار مداحی سے انہیں اتنی سہولت ضرور ملی کہ رسن ودار کی
نوبت نہ آئی۔

ذیل کی غزل ان کے دردِ نہاں کی آئینہ دار ہے۔ حکومت سے شکوہ کیا کرتے کہ وہ
یہ سمجھ کر کہ بغاوت کا ذمہ دار انہی کا طبقہ ہے "آمادۂ انتقام تھی"۔ مجبوری اور بے بسی کے عالم
میں انہوں نے بارگاہ ایزدی میں بڑ سوز شکوہ کیا۔ اس غزل کی ردیف اگر چہ صیغہ واحد متکلم
میں ہے لیکن اصل میں جمع متکلم کی متبادل ہے۔ یہ غزل مرزا کے حقیقی جذبہ اور شدت
احساس کا آئینہ ہے :-

نہ مرا دولت دنیا نہ مرا اجر جمیل
نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل

میرے لئے نہ دنیا کی دولت نہ میں نمرود جیسا طاقتور۔ نہ مجھے خلیل جیسا صبر نہ
مجھے توحید پرستی کا اجر میسر۔

بارقیباں کف ساقی بہ کے ناب کریم
باغریباں لب جیحون بہ دم آب بخیل

رقیبوں کے ہاتھوں میں شراب ناب کے جام غریبوں کے لئے دریائے جیحون کا
کنارہ بھی پانی دینے میں بخیل۔

اے بہ مسمار قضا دوختہ چشم ابلیس
بہ دم گرم رواں سوختہ بال جبریل

اے خدا تو نے مسمار قضا سے چشم ابلیس کو سی دیا اور دم گرم سے جبریل کے پر جلا دیے۔

با تو ام خرمی خاطر موسیٰ بر طور
با خودم خستگی لشکر فرعون بہ نیل

تو نے طور پر موسیٰ کی خرمی خاطر کا لحاظ رکھا اور تو نے دریائے نیل میں لشکر فرعون کو غرقاب کیا۔

بر کمال تو در انداز ہ کمال تو محیط
بر وجود تو در اندیشہ وجود تو دلیل

تیرے کمال کا کیا اندازہ کہ اسے خود تیرا کمال محیط ہے اور تیرے وجود پر خود تیرا وجود ہی دلیل محکم ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
اے بتر سا بچگاں کردہ مے ناب سبیل

اے خدا تو ایک پیاسے مسلمان کے لب پانی سے بھی تر نہیں کرتا جبکہ ترسا بچوں کے لئے تو نے شراب ناب عام کر دی ہے۔

جو لوگ مرزا کے عہد اور اس کے کرب ناک حالات ذہن میں رکھے بغیر اس کے کار داتی پر حرف گیر ہیں کیا وہ اس غزل کے مطالعہ کے بعد انصاف سے کہہ سکتے ہیں کہ مرزا کا دل انگریز گورنمنٹ کی طرف سے صاف تھا کوئی نفرت موجود نہ تھی مرزا نے یہ غزل لکھ کر علامتی شاعری کی طرح ڈالی ہے "رقیب"، "غریب"، سے کون لوگ مراد ہیں "کف ساقی"، سے مقصود کس کا کف ہے؟ اگر لفظ "رقیب"، حریف اور دشمن کے معنی دیتا ہے تو کیا اس سے برطانوی ارباب اقتدار مراد نہیں ہو سکتے؟ مرزا وہ سچے موحد تھے جنہیں اپنی بندگی پر ناز تھا۔ اسی ناز ہی کے بل پر انہوں نے کھلے الفاظ میں شکوہ کیا اور اسی شکوہ نے اقبال کو بھی لکھنے کا حوصلہ بخشا کہ

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بات موضوع سے کچھ آگے نکل گئی لیکن حالات کا پس منظر بیان کیے بغیر موضوع کا حق ادا ہونا ممکن نہ تھا۔

مثنوی "چراغ دیر" اور پیغام "جنوں"

مرزا بحالی پنشن کے سلسلہ میں گھوڑا گاڑی کا اذیت ناک سفر مہینوں میں طے کرکے جب بنارس پہنچے تو کلکتہ جو منزل مقصود تھا ہنوز بہت دور تھا۔ تکان دور کرنے کے لئے بنارس میں کافی وقت گزارا۔ اس شہر کے نظاروں نے ان کے احساس شعری کو کچھ ایسی تحریک دی کہ ایک بہت ہی خوبصورت مثنوی جو بقول مالک رام کے ادبیات فارسی میں اہم مقام رکھتی ہے "چراغ دیر" کے معنی خیز نام سے وجود میں آگئی۔ اس مثنوی میں شکوۂ احباب اور مناظر وارناسی کی بے مثال منظر کشی کے بعد حرف مطلب کی طرف گریز کا موقع آیا تو ان کے تنوع پسند دماغ نے ایک پیر روشن ضمیر پیدا کیا تاکہ از رہ احتیاط پسندی جو کچھ اپنی زبان سے کہنا خلاف مصلحت ہو اسے پیر کی زبان سے ادا کرادیا جائے۔

مرزا نے پیر سے پوچھا کہ آج کے جیسے حالات میں کہ باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کے خون کا پیاسا ہے' قیامت کیوں نہیں آجاتی؟ پیر نے کہا خدا کی مصلحت نہیں کہ یہ کاشی یہ رنگین بنارس زمین بوس ہو۔ اے کارافتادہ غالب تو چشم یار و اغیار سے دور یہاں اس رنگین چمن کے جلوے کیا دیکھ رہا ہے۔ اٹھ اور اپنے خون سے اپنا بہشت تیار کر۔

جنونت گر بہ نفس "خود"، تمام است
زکاشی تا بہ کاشاں نیم گام است

اگر تیرا "جنوں" خود تیرے نفس پر تمام ہو جائے تو کاشی سے کاشان تک کی راہ دو قدم سے زیادہ نہیں۔

چو بوے گل زپیراہن بروں آ

بہ آزادی زبند تن بروں آ

پھول کی خوشبو کی طرح اپنے وجود سے باہر آ' بند تن سے آزادانہ باہر نکل۔

ترا اے بے خبر کاریست درپیش

بیابانے وکہا ریست درپیش

تر ازاندوہ مجنوں بود باید

خراب کوہ وہاموں بود باید

تن آسانی بہ تاراج فنا دہ

چو بینی رنج "خود،، را رونما دہ

اے بے خبر تجھے بڑے کام درپیش ہیں کوہ و بیاباں کا سفر درپیش ہے۔ تجھے تو غم و اندوہ سے مجنوں ہو جانا چاہئے 'پہاڑوں اور دریاؤں کے مصائب جھیلنا چاہئیں 'تن آسانی چھوڑ اور جب کوئی مشکل سامنے آئے تو "خود،، کو مقابل لا۔

ہوس را سربالین فنا نہ

نفس را از دل آتش زیر پا نہ

دل از تاب بلا بگداز و خون کن

ز دانش کار نکشاید جنوں کن

نفس تا خود نخشید از پای

دمے از جادہ پیمائی میاسا

ہوس کا سر بالین فنا پر رکھ سوز دل سے سانس کو ایسا تیز کر گویا پیر کے نیچے انگارا آ گیا ہے۔ شدت بلا سے دل پگھلا کر خون کر اور اگر دانش سے کام نہ چلے تو جنوں اختیار کر۔ جب تک سانس خود ہی تھک کر نہ رکنے لگے ایک دم کے لئے جادہ پیمائی ترک نہ کر۔

مرزا کا حاصل کلام یہ نعرہ ہے کہ "زدانش کار نکشاید جنوں کن۔

مرزا نے دانش و جنوں کا فرق واضح کر کے اپنے عصر کو جہد و عمل کا جرأت آموز پیغام دیا ہے اس سے پہلے اس کی کوئی مثال فارسی شعر و ادب میں نہیں آملتی۔ ایران میں رودکی سے ملک الشعرا بہار تک اور ہندوستان میں خسرو سے بیدل تک کسی نے بھی گوہر مقصود حاصل کرنے کے لئے "جنوں کن،، کا مشورہ نہیں دیا۔ جنوں اک ایسے انتہائی جذبہ اور اقدام کا نام ہے جس میں مصلحت، دور اندیشی اور خوف کی نفسیات کا خاتمہ ہو جاتا ہے' جنوں مقام عشق کی وہ منزل ہے جہاں انسان بھڑکتی آگ میں کود سکتا ہے' طوفان سے ٹکرا سکتا ہے' پہاڑ کھود سکتا ہے۔ اور جوئے شیر نکال سکتا ہے۔ دنیا میں لوگوں نے جتنے بھی بڑے اور تاریخی اہمیت کے کام انجام دئے ہیں' جان پر کھیل کر انجام دئے ہیں' یہ ایک ایسا عمل جہاد ہے جو ناکامی کے تصور کے بغیر انجام دیا جاتا ہے۔ مرزا نے جنون کے علی الرغم دانش کا ذکر کیا ہے' دانش قدم قدم پر انسان کی رہنما ہے' مصلحت کوشی دور اندیشی اور احتیاط پسندی کی ترغیب دیتی ہے یہ قدرت کا اک عطیہ خاص ہے۔ یہ ایک روحانی پیغمبر ہے جس کا کام ہر نفس راہ راست دکھانا ہے لیکن ان تمام صفات کے باوصف وہ جنون کی حریف ہے' طوفانی لہروں سے کھیلنے سے روکتی ہے' حفظ جان کے تصور میں مبتلا رکھتی ہے۔ جنوں کا تعلق انسان کے اپنے "احساس نفس،، "احساس ذات،، "خود شناسی،، سے ہے صوفیائے کرام نے احساس نفس کو عرفان ذات خداوندی تک محدود رکھا ہے اور اس قول حق کو شمع راہ بنایا ہے کہ ؎

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا۔ لیکن "عرفان نفس،، وسیع تر مفہوم کا حامل ہے آدم اپنی پوری نوع کے ساتھ صفحۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ زباں قدرت نے اسے خلافت ارض پر قادر ہونے کی بشارت دی ہے:

سَخَّرَ لَکُم مَا فِی السَّمٰوٰاتِ وَمَا فِی الارضَ

ارض و سمٰوات میں جو کچھ ہے تمہارے لئے تسخیر کر دیا گیا ہے۔

اگر تسخیر کائنات انسان کے دائرۂ کار میں شامل ہے تو اس کے لئے جنوں درکار ہے۔ یہ حصول مقصد کا جنوں ہی تو ہے کہ انسان کے قدم چاند پر پہنچے' ہوا میں پرواز ممکن ہوئی اور سینۂ ارض کے ذخائر نکال لئے گئے۔ دانش پر تکیہ کرنے والوں سے زمین کا چپہ چپہ آباد ہے لیکن اہل جنون آٹے میں نمک کی بقدر بھی نہیں' مرزا کی عام تعلیم یہ ہے کہ انسان کو جب مصائب کا سامنا ہو تو وہ "خود،، کو سامنے لائے "خود،، کیا ہے انسان کا "پُر اسرار وجود معنوی،، یا بالفاظ دیگر اصل وجود نوع انسان میں ہر شخص ایک دوسرے سے پہچان کی حد تک مختلف ہے لیکن باعتبار اعضاے بدن ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ اس کا اصل تشخص اس کا وجود معنوی اور وہ مضمر و مستور قوت و صلاحیت ہے جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ مرزا نے اسی قوت کے عرفان کا مشورہ دیا ہے اس مشورہ کے ساتھ ایک مبہم سا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ مشورہ سفر کلکتہ کے درمیان ہی کیوں دیا؟ کیا موقع اور وقت کے تعین میں کوئی مصلحت خاص تھی؟۔ اگر حالات کا جائزہ ایک بالکل نئے زاویہ سے لیا جائے تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف زبان تو نہ کھول سکتے تھے لیکن ان کے دل میں یہ تمنا ضرور تھی کہ کوئی انقلاب رونما ہو لیکن اس کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ممکن ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے تعلق سے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ شاید راکھ کے ڈھیر میں کوئی ایسی چنگاری ابھی موجود ہو جو جلد یا بدیر پھر کسی دن شعلہ بن کر ابھرے اور انہوں نے اسی مبارک دن کے انتظار میں اپنے عصر کو "جنوں،، اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ مرزا کا یہ انتظار ۱۸۵۷ء میں کچھ کم ہوا اور بالآخر ۱۹۴۷ء کو پوری طرح ختم ہو گیا۔ انگریزوں کے خلاف مرزا کے دل میں کتنی نفرت ہے آٹھ نو شعر کے ایک قطعہ کا حسب ذیل شعر اس کا آئینہ ہے۔

بسکہ فعال مایرید ہے آج

ہر سلح شور انگلستان کا

۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کو مرزا ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "الغرض نہ جانا' امیر' غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے نکالے گئے' جاگیر دار پنشن دار و اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے'

مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کیا یہ ڈر عناد اور نفرت کی علامت نہیں؟

ردیف بگردانیم میں انقلابی ذہن کی جھلک

بیاکہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضابہ گردش رطل گراں بگردانیم
زچشم ودل بہ تماشاتمتع اندوزیم
زجان و دل بہ مدارا زیاں بگردانیم
بگوشۂ بنشینم و در فراز کنم
بہ کوچہ برسرہ پاسباں بگردانیم
اگر زشحنہ بود گیرودار نیند یشم
وگرزشاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنم
وگر خلیل شود مہماں بگردانیم
ندیم ومطرب وساقی زانجمن رانیم
بکاروبارزنی کار داں بگردانیم
بوہم شب ہمہ را در غلط بیند ازیم
زشمہ رہ رمہ راباشباں بگردانیم
بہ صلح بال فشانان صبح گاہی را
زشاخسار سوے آشیاں بگردانیم
بجنگ باج ستانان شاخساری را
تہی سبدزدرگلستاں بگردانیم

یم زحیدر من و تو زماعجب بنود
گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

آکہ ہم مل کر آسماں کا قاعدہ بدل دیں۔ قضا کو گردش جام میں گردش دے دیں دل و نظر سے تماشے کا لطف اٹھائیں۔ جان و دل کے ساتھ اندیشہ زیاں ختم کر دیں۔ کسی گوشہ میں بیٹھ جائیں' در کھلا چھوڑ دیں اور سر راہ اگر کوئی پاسباں موجود ہو تو اسے لوٹا دیں۔ اگر شحنۂ شاہی سے جھگڑا ہو تو فکر نہ کریں اور اگر تحائف شاہی آئیں تو انہیں واپس کر دیں۔ اگر کلیم ہمزباں ہوں تو بھی بات نہ کریں' خلیل مہماں ہوں تو ان کو بھی واپس بھیج دیں۔ ندیم' مطرب' ساقی سب کو انجمن سے نکال دیں زن کاردان کو بھی مع کاروبار واپس کر دیں۔ مویشیوں کے گلہ کو مع اس کے محافظ کے وہم شب میں مبتلا کر کے آدھے راستہ ہی سے لوٹا دیں۔ جو لوگ شاخساروں سے باج لیتے ہیں ان کو گلستاں سے تہی سبد ہی لوٹا دیں۔ سحر کے وقت بال فشاں پرندوں کو دوستی کے ساتھ شاخسار سے آشیانوں کی طرف واپس بھیج دیں۔ "ہم تو حیدری ہیں تجھے اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اگر ہم بھی آفتاب کو مغرب سے مشرق کی طرف لوٹا دیں۔،،

غزل معنویت کے اعتبار سے پر اسرار اور نظم کی طرح مسلسل ہے' تسلسل سے اس شبہ کو اور تقویت ملتی ہے کہ فکر ایک ہی نقطہ پر گردش کر رہی ہے۔ قاعدہ آسمان کی روایت توڑ ڈالیں قضا و قدر کے فیصلے بدل دیں (رجعت شمس کا تاریخی واقعہ)

دل و نظر سے تماشا دیکھیں اندیشۂ زیاں دل سے دور کر دیں' کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں سر راہ کوئی پاسبان شاہی ہو تو اسے واپس لوٹا دیں' پاسبان سے جھگڑے کی نوبت آئے تو فکر نہ کریں' شاہی تحائف کی رشوت ہو تو قبول نہ کریں۔ کوئی بانداز کلیم ہمزباں ہو تو اس سے بات نہ کریں کوئی بصورت خلیل مہماں ہو تو اسے رخصت کر دیں۔ ندیم، مطرب، ساقی، زن کاردان سب کو محفل سے نکال دیں مویشیوں کے وہ گلے جو میانِ راہ ہوں انہیں رات ہو جانے کے غلط اندیشہ میں مبتلا کر کے معہ محافظ واپس کر دیں جو لوگ

شاخساروں سے خراج وصول کرتے ہیں انہیں نرمی کے ساتھ آشیانوں کی طرف واپس کردیں اور ہم چوں کہ حیدری ہیں اس لئے کوئی حیرت کی بات نہ ہو اگر ہم بھی کوئی خرق عادت کام سرانجام دیں۔ یہ سارا اہتمام کس مقصد سے ہے؟ کس کے خلاف ہے؟ باج ستان کون لوگ ہیں؟ تہی سبد لوٹانے کا حوصلہ کس کے خلاف ہے؟

گوشہ میں بیٹھنے کی رازداری کیوں ہے؟ محافظ سرکاری، ندیم، مطرب اور ساقی کو انجمن سے کیوں نکالا جارہا ہے؟ پاسبان سے گیر ودار کا اندیشہ کیوں ہے؟ شاہی تحفہ کا لوٹانا کیوں ضروری سمجھا گیا ہے؟

کون دے ان سوالوں کا جواب جو جواب دینے کے اہل ہیں انہیں ان سوالوں کے پڑھنے ہی کی فرصت نہیں جبکہ الفاظ کے بطون میں صاف اشارہ غیر ملکی حکمرانوں کی جانب ہے۔ پوری غزل مرزا کی دانش وری، دور اندیشی اور مصلحت بینی کا شاہکار ہے۔

برطانوی اقتدار اور حالات کی دردناک تصویر

کسی دیدہ ور شاعر کی ذمہ داری اگر جہد و عمل کے جذبات کو تحریک دینا ہے تو اپنے عصر کو امکانی اندیشوں سے باخبر رکھنا بھی ہے۔ ہنگامی حالات سے متاثر ہونا انسانی فطرت ہے اس میں شاعر اور غیر شاعر کسی کی کوئی تفریق نہیں۔

ذیل کی غزل میں مرزا نے برطانوی اقتدار کے استحکام کے بعد دلی کے حالات کی دردناک تصویر کشی کی ہے، شاعر کے ذہنی پس منظر میں جارحیت کے خلاف شدید نفرت کا احساس صاف طور پر جھلکتا ہے۔

بہ وادیی کہ دران خضر را عصا خفتست
بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست

اس وادی میں کہ جہاں خضر کا عصا بھی حرکت سے محروم ہو چکا ہے میں سینہ کے

بل رینگ رہا ہوں اس لئے کہ پیر سو چکا ہے۔

ہوا مخالف وشب تار و بحر طوفان خیز
گستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

ہوا مخالف ہے، رات تاریک ہے، بحر طوفان خیز ہے، کشتی کا لنگر ٹوٹ چکا ہے اور ناخدا سویا ہوا ہے۔

غمت بہ شہر شبخوں زناں بہ بنگۂ خلق
عس بخانہ وشہ در حرم سرا خفتست

غم شہر کی آبادی پر شب خون مار رہا ہے، محافظ اپنے گھر میں اور بادشاہ حرم میں محو خواب ہے۔

دلم بہ سبحہ وسجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

میرا دل تسبیح، سجادہ اور ردا کے بارے میں لرز رہا ہے کہ "دزد مرحلہ" تو بیدار ہے اور پارسا سویا ہوا ہے (تسبیح، سجادہ، ردا "دزد مرحلہ،، اور "پارسا،، اپنے روایتی معنی سے مختلف بھی نہیں ہیں لیکن علامتی انداز فکر نے انہیں کسی حد تک مبہم بنادیا ہے)۔

بہ بین ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را
دریچہ وا و بدروازہ اژدہا خفتست

(یہ ہے قلعہ معلی کی اس وقت کی تصویر جب مرزا نے یہ غزل لکھی تھی)۔
حالات دور سے دیکھ، قرب شہ حاصل کرنے کی کوشش مت کر کہ اگرچہ دریچہ کھلا ہے لیکن دروازہ میں اژدھے سو رہے ہیں۔

دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

(ہنگامۂ گیر و دار ختم ہونے کے بعد کا یہ مقطع بے بسی کی دردناک تصویر ہے) اب

راہ کے محفوظ ہونے اور کعبۂ مقصود کے قریب ہونے سے بھی کیا حاصل کہ ناقہ رفتار سے محروم ہو چکا اور پیر سو گیا۔

بخواب چون خودم آسودہ دل مداں غالبؔ
کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

غالبؔ میں خواب میں ہوں مجھے آسودہ دل مت سمجھنا خون میں غرق ہو کر سویا ہوں دیکھئے کب تک سوتا رہوں۔

شاعری میں ان الفاظ کے مروج معنی کو اشارتی اور ایمائی انداز سے حسب ضرورت نئے معانی پہنانا کمال فن سمجھا جاتا ہے۔ یہی صحیح علامتی شاعری ہے مرزا اپنے وقت کے نبض شناس تھے 'انہوں نے وقت اور حالات کی ایک اندوہناک تصویر علامتی الفاظ میں پیش کی ہے۔ غزل کے کم و بیش سبھی اہم الفاظ اپنے روایتی مفہوم سے مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔

وادی، دلی کا قائم مقام ہے اور باقی الفاظ ہوا، شب تار، بحر طوفاں خیز، لنگر، کشتی، ناخدا، عسس 'سبحہ 'سجادہ 'ردا، دزد مرحلہ 'پارسا اور اژدھا سبھی اک ایسے ماحول کی داخلیت کا پتہ دیتے ہیں جو روح فرسا ہے اور آخر میں "ایمنی راہ،، اور قرب کعبہ کا ذکر کہ تباہی کے بعد رہا ہی کیا ہے کہ اس سے کوئی حظ حاصل ہو۔ مرزا کے کلام میں مذکورہ غزل کی خاص اہمیت ہے۔ یہ اس وقت کے حالات کا ایک عکس ہے جو پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے اور اعلان امن ہو جانے کے بعد دھلی میں پائے گئے ان سے نئے حکمرانوں کے خلاف شاعر کے جذبہ نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔

مرزاکامسلک صلح کل

مقصود ماز دیر وحرم جز حبیب نیست
ہر جاکنیم سجدہ بداں آستاں رسد

دیر وحرم سے ہمارا مقصود حبیب کے علاوہ کوئی اور نہیں، سجدہ ہم کہیں بھی کریں اسی کے آستان تک پہنچتا ہے۔

انگریزوں نے دھلی پر مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد "تقسیم کرو اور حکومت کرو،، کی پالیسی اپنائی تاکہ آبادی کے بڑے طبقات باہمی اختلافات میں الجھ جائیں۔ فرقہ وارانہ کشمکش عوام کو متحدہ نہ ہونے دے اور حکمران کبھی ایک طبقہ کو کبھی دوسرے کو شہ دے کر حکومت کو مستحکم بناتے رہیں۔ مرزانے اس شرمناک پالیسی کے خلاف نظریہ "صلح کل،، کی تبلیغ کی۔ یہ ایک تعمیری اور صالح نقطہ فکر تھا اور عملاً قانون کی دسترس سے باہر تھا۔ یہ مختلف طبقات کی ذہنی تربیت کا ایک ذریعہ تھا اس میں قومی احساس کی روح کارفرما تھی۔ پروفیسر احتشام حسین کا تجزیہ یہ ہے کہ "مرزاگو ہندوستانی سماج کے دور انحطاط سے تعلق رکھتے تھے یعنی ایسے انحطاط سے جو ہر طبقہ کو بے جان بنائے ہوئے تھا لیکن ان کی فکر میں توانائی اور تازگی 'ان کے خیالات میں بلندی اور بیبا کی غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہے۔

یہ فکری توانائی ہی تھی کہ انہوں نے حکومت وقت کا منصوبہ ناکام بنانے کے لئے "صلح کل،، کے نظریات سے سماج میں اتحاد ویگانگت کا بیج بویا۔

مائیم ذوق سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ
در عشق نیست کفر زایماں شناختن

ذوق سجدہ میں مسجد و بتکدہ کی کیا قید عشق میں کفر کو ایمان سے نہیں پہچانا جاتا۔

خوش بود فارغ زبند کفر وایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

کفر وایمان کی آویزش سے آزاد رہ کر جینا اچھا ہے بحالت کفر مرنے پر افسوس' بصورت مسلمان جینے پر افسوس' مذہب اختلاف عقائد کی بنیاد پر نوع بشر کے درمیان تفریق کی حمایت نہیں کرتا۔

سنگ وخشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
فائۂ در کوے ترسایان عمارت می کنم

میں ویران مسجد سے سنگ وخشت شہر لے آتا ہوں تاکہ کوے ترسایان میں عمارت تعمیر کردوں انسان دوستی کا اس سے زیادہ اعلیٰ تصور اور کیا ہو سکتا ہے۔

زاہد مناز چندیں زنارم ار گستی
از جبہ ام نہ دزدد کس سجدۂ صنم را

زاہد اس بات پر نازمت کر کہ تو نے میرا "رشتہ زنار،، توڑ دیا۔ میری پیشانی سے "سجدۂ صنم،، کو کوئی نہیں چرا سکتا۔ سعدی کا قول ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

ہوشیار کی نظر میں اگر برگ سبز مظہر ذات اور ذریعہ عرفان ہے تو وجود سنگ کیوں نہیں جو اپنے منجمد ثقل کے باوجود صفت نمو سے بھی متصف ہے۔

کردہ ام ایمان خود را دست مزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ وعبادت می کنم

میں پتھر سے پیکر تراشتا ہوں اور عبادت کرتا ہوں' میرا ایمان اس پیکر تراشی کی مزدوری ہے۔

غالب ترا بہ دیر مسلماں شمردہ اند
آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

غالب تجھے دیر میں مسلمان سمجھا جاتا ہے ہاں دروغ مصلحت آمیز کی بات ہوگی۔

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نشد و غالب و کافر نتواں گفت

اس شیفتہ سے ہمیں عجب کام آپڑا ہے جس کے نزدیک غالب، مومن بھی نہیں ہے اور اسے کافر کہنا بھی ممکن نہیں۔

مسلک توحید

عقل در اثبات وحدت خیرہ می گردد چرا
ہر چہ جز ہستی است ہیچ و ہر چہ جز حق باطل است

عقل اثبات وحدت میں کیوں خیرہ چشم ہے۔ ہستی کا ہر جزو ہیچ اور سوائے حق کے جو کچھ ہے وہ سب باطل ہے یہ ہے وحدۃ الوجود پر مرزا کا ایمان محکم۔

زالّا دم زن و تسلیم لا شو
بگو اللہ و برق ماسوا شو

الّا سے دم مار اور لا کا اقرار کر اللہ اللہ کہہ اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے اس کے لئے برق سوزاں بن۔

رموز دین نہ شناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

میں رموز دین نہیں پہچانتا ٹھیک ہے معذور بھی ہوں کہ میری نہاد عجمی اور میرا طریق عربی ہے۔

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر است

نازم بکفر خود کہ بایں برابر است

میں نے کہا کہ حدیث دوست قرآن کی برابر ہے اگر یہ کفر ہے تو مجھے اس پر ناز ہے
کہ یہ ایمان کے ہم مرتبہ ہے۔

وجود او ہمہ حسن است و ہستم ہمہ عشق

بہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگند است

اس کا وجود تمامتر حسن اور میری ہستی سراپا عشق ہے "بخت دشمن"، اور "اقبال"،
دوست کی قسم یہی مسلک صحیح ہے۔

گر مہر و گر کیں ہمہ از دوست قبول است

اندیشہ جز آئینہ تصویر نمانیست

دوست کی طرف سے محبت ہو یا کینہ ہمیں سب گوارا ہے۔ اندیشہ کی حیثیت تو اس
آئینہ سے زیادہ نہیں جو صرف عکس دکھلاتا ہے۔

جنت نہ کند چارۂ افسردگی دل

تعمیر باندازۂ ویرانی مانیست

جنت ہماری افسردگی دل کا علاج نہیں اُس کی تعمیر بقدر ویرانی دل نہیں ہے۔ اور
آخری فیصلہ کن بات یہ ہے کہ۔

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

ہمارا مقصد حرم و دیر سے حبیب کے علاوہ اور کچھ نہیں سجدہ کہیں بھی کریں اسی
کے آستان تک پہنچتا ہے۔

گرد پندار وجود از رہگزر خواہد نشست

بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

جب پندار وجود کی گرد دب جائے گی اس وقت توحید عیانی کا سمندر موجیں مارے گا۔

پردہ ہا ازروے کار ہمہ گر خواہد فتاد

خلوت گبر و مسلماں انجمن خواہد شدن

جب آپس میں روے کار سے پردے اٹھ جائیں گے گبر و مسلمان کی خلوت انجمن میں بدل جائے گی۔

عالم ہمہ مرآت وجود است عدم چیست

تا کار کند چشم محیط است و کراں نیست

تمام عالم آئینہ وجود ہے 'عدم کہاں ہے 'نگاہ کہاں تک کام کرے کہ وجود محیط ہے اور وہ کراں تا کراں ہے۔

زجوش شکوۂ بیداد دوست می ترسم

مباد مہر سکوت از دہن فرد ریزد

شکوہ بیداد دوست سے ڈرتا ہوں کہ کہیں مہر سکوت دہن سے گر کر نہ ٹوٹ جائے اہل اللہ بھی سکوت ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مرزا کا غم نشاط انگیز

مرزا غم میں اک لطیف سا نشاط محسوس کرتے ہیں نظریہ یہ ہے کہ ؎

غم لذت است خاص کہ طالب بذوق آں

پنہاں نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک

غم اک ایسی لذت ہے کہ صاحب ذوق اس سے داخلی طور پر نشاط پاتا ہے اور

ظاہری طور پر اذیت محسوس کرتا ہے۔

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگر اند

روز روشن بوداع شب تار آمد و رفت

شادی اور غم ایک دوسرے سے سرگشتہ تر ہیں۔شب تار گزرنے کے بعد روز روشن نمودار ہوتا ہے اور وہ چلا جاتا ہے۔ مرزا نے "ایک سو چالیس شعر کی نظم" مغنی نامہ،، میں غم کا ایک بہت ہی خوبصورت تصور پیش کیا ہے۔ان کے نزدیک غم اک ایسا چراغ ہے جو روغن کے بغیر روشنی دیتا ہے۔ غم جاناں میں تو ہر صاحب دل لذت نشاط پاتا ہے۔ لیکن مرزا کا امتیاز یہ ہے کہ وہ غم دوراں میں بھی راحت محسوس کرتے ہیں اور اسے عطیہ دوست سمجھ کر رگ جاں بنا لیتے ہیں۔ مغنی نامہ کے چند منتخب شعر ملاحظہ ہوں۔

شب از تیرگی اہر من روے بود

زسودا جہاں اہر من خوے بود

رات سیاہی میں اہرمن کے چہرہ جیسی کالی اور تاریکی میں اہرمن خو جیسی تھی۔

بخلوت ز تار یکیم دم گرفت

نشاط سخن صورت غم گرفت

ایک رات اندھیرے میں تاریکی سے میرا دل گھبرا گیا اور نشاط سخن نے غم کی شکل اختیار کر لی۔

دران کنج تاریک وشب ہولناک

چراغے طلب کردم از جان پاک

اس تاریک گوشہ اور ہولناک رات میں میں نے "جان پاک،، سے چراغ طلب کیا۔

چراغے کہ باشد زہر پروانہ دور

چراغے کہ بادا زہر خانہ دور

اک ایسا چراغ جس پر نہ پروانے نثار ہوں نہ وہ چراغ خانہ جیسا ہو۔

نہ بینی نشانے ز روغن درو

کند شعلہ برخویش شیون درو

جس میں تیل کا کوئی نشان نہ ہو اور جس کی لو خود اپنے وجود پر شیون کرتی ہو۔

چراغے کہ بے روغن افروختم

دلے بود کز تاب غم سوختم

وہ چراغ جو میں نے بغیر تیل کے روشن کیا' اک دل تھا جسے میں نے "تاب غم،، سے جلایا۔

زیزداں غم آمد دل افروز من

چراغ شب و خترروز من

خدا نے مجھے غم دل افروز عطا کیا' یہ غم میری رات کا چراغ اور میرے دن کا ستارا ہے۔

نہ شاید کہ من شکوہ سنجم ز غم

خرد رنجد از من چو رنجم ز غم

میرے لئے اس غم کا شکوہ کرنا موزوں نہیں' اگر میں کوئی رنج محسوس کروں تو عقل مجھ سے ناراض ہو گی۔

غم دل ز غم مرحبا جوے باد

دلم زار ولب مرحبا گوے باد

غم دل غم سے مرحبا گوئی کی توقع کرے اور میرا دل زار بھی ہو تو بھی لب مرحبا کہے۔

دلم ہمچو غالب بغم شاد باد

بدین کنج ویرانہ آباد باد

میرا دل غم سے شاد ہو اور یہ کنج ویرانہ اس سے آباد ہو۔

وحشتے نیست اگر خانہ چراغے دارد

بادل از تیرگی خاک چہ باک؟

اگر گھر میں چراغ موجود ہو تو تیرگی خاک سے دل کو کیا خوف؟ اور کیسی

وحشت ؟۔

بارضائے تو ناسازیٔ ایام چہ بیم
باوفائے توز بے مہریٔ افلاک چہ باک

اس کی رضا شامل ہو تو زمانہ کی ناسازگاری کا کیا خوف؟ اور اس کی وفا ہو تو افلاک کی بے مہری کا کیا اندیشہ؟۔

عیش و غم در دل نمی استد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکساں است در غربال ما

آزادیٔ طبع کا بھلا ہو کہ دل میں عیش یا غم قرار نہیں پاتے۔ شراب اور خونابہ ہمارے لئے دونوں برابر ہیں۔

حاشا کہ زغم نالم اگر غم غم عشق است
پیوند نشاط است بدین زمزمہ دل را

ہر گز ایسا نہیں کہ میں غم سے روتا ہوں اگر وہ غم "غم عشق،، ہے اس لئے کہ اس زمزمہ سے تو دل کو نشاط کا احساس ہوتا ہے۔

بہ رنج از پئے راحت نگاہداشتہ اند
زحکمت است کہ پاے شکستہ در بند است

انسان کو راحت کے خیال سے رنج دیا گیا ہے پاے شکستہ کو باندھ کر رکھنا خالی از حکمت نہیں۔

خوش است آنکہ باخویش جز غم ندارد
و لے خوشتر آنست آں کہ ایں ہم نہ دارد

خوش وہ شخص ہے جو بجز غم کے اور کچھ نہ رکھتا ہو لیکن زیادہ خوش وہ ہے جو غم بھی نہ رکھتا ہو۔

خاکسار کے قصیر و حقیر مطالعہ کے مطابق صف شعراء میں مرزا پہلے شخص ہیں

جنھوں نے غم میں نشاط کا ادراک کیا ہے اور مقام غم کی عظمت کا تعین کیا ہے۔ ایران میں رودکی سے ملک الشعرا بہار تک اور ہندوستانی فارسی شاعری میں خسرو سے بیدلؔ تک "نشاط غم،، کا کوئی تصور موجود نہیں۔

حدود جبر واختیار

جبر واختیار کا مسئلہ ہمیشہ نزاعی رہا ہے۔ اکثر فلاسفہ اور صوفیا اختلافی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ مرزا اپنی ذات کے عرفان کے معاملہ میں باطنی صلاحیتوں سے کام لینے کے اور جدوجہد کرنے میں اختیار کے اور نتائج کے باب میں جبر مشیت کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اختیار کے سلسلہ میں "عرفان ذات،، کے تحت بحث کی جا چکی ہے اور نمونۂ کلام بطور سند پیش کیا گیا ہے لیکن دونوں حالتوں میں اس بات کو نظر انداز نہ کیا جانا چاہئے کہ مرزا جالینوس اور ارسطو کی طرح فلسفی محض نہیں تھے' فلسفیانہ نقطہ نظر رکھنے والے آزاد خیال شاعر تھے اور شاعر پر مختلف حالات میں اکثر مختلف و متضاد کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ شاعری فلسفہ کی طرح جامد اور غیر متحرک نہیں ہوتی' فلسفہ اپنے لگے بندھے نظریات کا پابند ہوتا ہے جبکہ شاعر ہر قسم کی کیفیات اور جذبوں کی عکاسی کرتا ہے' ایسے مقامات کو تضاد فکر سے تعبیر کرنا شاعر کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔

از دلِ تست آنچہ بر من می رود
می شناسم گردش ایام را

جو کچھ مجھ پر گزرتی ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ گردش ایام کو تو میں خوب پہچانتا ہوں۔

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند
خودرا بہ زور بر تو مگر بستہ ایم ما

اپنے بندہ پر ایسی سختی مناسب نہیں' ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے بزور خود کو تجھ

سے وابستہ کر لیا ہے۔

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیمااست
نہ تیزگامی توسن زتازیانہ تست ؟

اگر میرا اندیشہ آسماں پیما ہے تو میرا کیا قصور' میرے توسن فکر کی تیز گامی کیا تیرے تازیانہ لگانے کا نتیجہ نہیں؟

دوش کز گردش بخت گلہ بر روے تو بود
چشم سوئے فلک و روے سخن سوئے تو بود

کل جب میں اپنی گردش بخت کا شکوہ کر رہا تھا تو اگر چہ آنکھ آسمان کی طرف تھی' مگر روے سخن تیری ہی طرف تھا۔

دل از تو بود و توپے الزام ما زما
بر دی نخست آنچہ ز جنس شعور بود

دل تیرا ہی عطیہ تھا لیکن تو نے ہمیں الزام دینے کے لئے جو کچھ جنس شعور سے ہمارے پاس تھا وہ پہلے ہی لے لیا۔

شمار کج روی دوست در نظر دارم
درین نوردندانم کہ آسماں چنداست

دوست کی کجروی میری نظر میں ہے اس سلسلہ میں مجھے نہیں معلوم آسماں کا کہاں تک دخل ہے ؟

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ خوبی او خوبی خداونداست

اگر میرے لئے نہیں تو خود اپنے لئے ہی مجھے عزیز رکھ کہ بندہ کی خوبی خالق ہی کی خوبی ہے۔

چنیں کہ نخل بلند است وسنگ ناپیدا
زمین تا نہ فتد خود زشاخسار چہ حظ

ایسی صورت میں کہ درخت بلند ہے اور کوئی پتھر بھی پھل گرانے کے لئے نہیں، پھل جب تک خود ہی زمین پر نہ گرے شاخسار سے کیا فائدہ؟

دراں چہ من نتوانم زاحتیاط چہ سود
بد آنچہ دوست نہ خواہد زاختیار چہ حظ؟

ایسی صورت میں کہ معاملہ کا حل میرے امکان میں نہ ہو، احتیاط برتنے سے بھی کیا حاصل اور وہ بات جو دوست کو منظور نہ ہو اس پر اختیار ہونے سے بھی کیا فائدہ؟۔

دلہائے مردہ را زنشاط نفس چہ کار
گلہائے چیدہ راز نسیم سحر چہ حظ؟

جو دل مردہ ہو چکے ہوں ان کو نشاط انفاس سے کیا حاصل، جو پھول توڑے جا چکے انہیں نسیم سحر سے کیا فائدہ؟

چوں پردۂ محافہ بہ بالا نمی رود
ازوے بہ داعیان سر رہگور چہ خط

جب محمل کا پردہ ہی اوپر نہیں اٹھتا تو سر رہگور د عویداران دید کو کیا فائدہ؟

زان سوے کاخ روزن دیوار بستہ اند
بے دوست از مشاہدۂ بام ودر چہ حظ

اس کے محل کے تو روزنِ دیوار تک بند کر دے گئے ہیں، دوست ہی نظر نہ آئے تو بام و در کے نظارے سے کیا حاصل؟۔

ہرچہ فلک نہ خواستست ہیچ کس از فلک نخواست
ظرف فقیہ مے نہ جست، بادۂ ماگزک نخواست

جو کچھ فلک نے نہیں چاہا وہ کسی نے بھی فلک سے نہیں چاہا، ظرفِ فقیہ نے

شراب نہ مانگی ہماری شراب نے گزک نہ چاہی۔

شحنۂ دہر برملا ہرچہ گرفت پس نہ داد

کاتب بخت در خفا ہرچہ نوشت حک نخواست

شحنۂ دہر نے برملا جو کچھ لے لیا واپس نہ دیا کاتب تقدیر نے پردۂ خفا میں جو کچھ لکھ دیا اسے مٹایا نہیں۔

پے عتاب ہمانا بہانہ می طلبد

شکایتے کہ زما نیست ہم بما دارد

وہ عتاب کے بہانے ڈھونڈتا ہے 'جو شکایت ہم سے نہیں ہوتی اسے بھی ہمارے ہی سر رکھتا ہے۔

ہمدم کہ زاقبال نوید اثرم داد

اندوہ نگاہ غلط انداز ندانست

ہمدم نے میرے اقبال کی نوید مجھے سنائی 'بیچارہ دوست کی نگاہِ غلط انداز سے واقف نہ تھا۔

دل نہ تنہا زفراق تو فغاں ساز دہد

رفتن عکس تو از آئینہ آواز دہد

دل ہی فقط تیرے فراق میں، فغاں نہیں کرتا تیرا عکس بھی جب آئینہ سے پرواز کرتا ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ حرکت سے آواز پیدا ہونا سائنسی نظریہ ہے مرزا نے اسے شعر میں استعمال کر کے شاعروں کو بحد سائنس بلند کر دیا ہے۔

امید پروری اور رجائیت

مرزا نے عدل خداوندی کے حوالہ سے معاشرہ کو صبر واستقامت کا مشورہ دیا۔ امام منتظر کے مدحیہ قصیدہ کی تشبیب فلسفیانہ فکر اور امید پروری کا شاہکار ہے۔ مطلع ہی سے حرف مطلب کا آغاز ہو جاتا ہے:

ہست از تمیز گربہ ہما استخواں دہد

آئین دہر نیست کہ کس رازیان دہد

ہما کی خلقی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کی غذا ہڈیاں تجویز کی گئی ہیں' دھر کا یہ دستور نہیں کہ وہ کسی کو زیاں پہنچائے۔

مرد است مرد ہرچہ کند بے خطر کند

راد است راد ہرچہ دہد رائگاں دہد

مرد وہ ہے جو ہر کام بے خوف ہو کر کرے' وہ شخص راد ہے کہ جو کچھ دے وہ بلا قیمت دے۔

گلزار را اگر نہ ثمر گل بہم نہد

درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد

گلزار کو اگر پھلوں سے محروم رکھا جاتا ہے تو اسے پھولوں سے مزین کر دیا جاتا ہے' درویش کو اگر صبح کو روٹی نہیں ملتی تو شام کو مل جاتی ہے۔

گنج سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر

وانگہ کلید گنج بہ دست زباں دہد

اگر کسی کے نہاں خانۂ ضمیر کو گنج سخن سے بھر دیا جاتا ہے تو اس خزانہ کی کلید زبان کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

تاروز خاک تیرہ نگردد زرشک چرخ

رخشانی ستارہ بہ ریگ رواں دہد

دن رشک چرخ سے تیرہ و تار نہ ہو جائے اس لئے ریگ رواں کو ستاروں جیسی چمک دے دی جاتی ہے۔

تا آدمی ملال نہ گیرد زیک ہوا

سرما و نوبہار و تموز و خزاں دہد

انسان کسی ایک ہی موسم سے دل برداشتہ نہ ہو اس لئے جاڑا' بہار اور تموز و خزاں کے موسموں سے اس کی تلافی کر دی جاتی ہے۔

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن
تا راحت مشام و نشاط رواں دہد

موسم بہار میں چمن چمن پھول کھلا دئے جاتے ہیں تاکہ وہ مشام جان اور نشاط روح کا سبب بنیں۔

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق
تا آرزوے کام و مراد دہاں دہد

موسم سرما میں طبق طبق میوے پیدا ہوتے ہیں تاکہ کام و دہن کی آرزو پوری ہو۔

آں راکہ بخت دسترس بذل مال نیست
طبع سخن رس و خرد خردہ داں دہد

ان لوگوں کو جو مال و دولت بانٹنے کی طاقت نہیں رکھتے سخن رس طبیعت اور خرد نکتہ داں دے دی جاتی ہے۔

آنراکہ طالع کف گنجینہ پاش نیست
نعم البدل زخامہء پرویں نشاں دہد

ان لوگوں کو جنہیں دست سخا حاصل نہیں بطور نعم البدل پرویں نشاں قلم دے دیا جاتا ہے۔

چون جنبش سپہر بہ فرمان داور است
بیداد نبود آنچہ بہ ما آسماں دہد

چونکہ گردش فلک حکم خداوندی کے مطابق ہے اس لئے آسمان کی طرف سے جو کچھ ہم پر گزر جاتا ہے وہ بیداد نہیں ہے۔

مرزا نے ایک ایسے زاویہ سے دعوت فکر دی ہے جو ہر انسان کے لئے قابل قبول اور طمانیت بخش ہے ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی کو بھی افضال خداوندی سے محروم نہیں رکھا گیا ہر کسی کو بقدر صلاحیت کچھ نہ کچھ دیا گیا ہے 'اس لئے جو کچھ میسر ہے وہ مقام شکر ہے مقام شکایت نہیں کہ شکایت الطاف خداوندی سے انکار اور ضعف ایمان کی علامت ہے۔

مقام دیدہ وری

مرزا عصری تقاضوں پر نگاہ رکھتے ہیں اس لئے فکر و نظر کی ہر سطح پر روایت شکن ہیں اپنے قصائد کی تشبیوں میں بھی مفروضہ داستانوں کی بجائے سماج کی فکری تربیت کا اہتمام کیا ہے اور جو کچھ غزل کے دامن تنگ میں سمانہ سکتا تھا اس کی تلافی قصائد کی تشبیوں سے کر لی ہے۔ عید سعید کے موقعے پر بہادر شاہ کے مدحیہ قصیدہ کی تشبیب میں دیدہ ورانہ انداز فکر سے کام لیا گیا ہے ۔

رہروان چون گہر آبلۂ پابینند
پاے را پایہ فراتر زثریا بینند

رہروانِ بلند حوصلہ جب اپنے پیر کے آبلوں کو دیکھتے ہیں تو اپنے پیر کا مرتبہ ثریا سے بھی برتر خیال کرتے ہیں۔

ہرچہ در دیدہ عیان است نگاہش دارند
ہرچہ در سینہ نہاں است زسیما بینند

جو کچھ پیش نظر ہے اسے محفوظ رکھتے ہیں اور جو کچھ سینہ میں پنہاں ہوتا ہے اسے پیشانی میں پڑھ لیتے ہیں۔

راہ زین دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض تپاں در تن صحرا بینند

راستہ ان دیدہ وروں سے معلوم کر جو گرم روی کی منزل میں صحرائی راستہ کو نبض

تپاں کی مثل تپتا ہوا دیکھتے ہیں۔

شررے راکہ بہ ناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار بتار رگ خارا بینند

دیدہ ور رگ سنگ پر زخمۂ کردار لگا کر اس شعلہ کو دیکھ لیتے ہیں جو پتھر سے اچانک پیدا ہونے والا ہوتا ہے۔

قطرۂ راکہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورت آبلہ برچہرۂ دریا بینند

وہ قطرۂ آب جسے بہر صورت موتی بننا ہے اسے دریا کی سطح پر بصورت آبلہ دیکھ لیتے ہیں۔

شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند
روز در منظر خفاش ہویدا بینند

شام کو ستارۂ صبح میں نمایاں اور دن کو منظر خفاش (چمگادڑ) میں واضح طور پر دیکھ لیتے ہیں۔

ہرچہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند
ہرچہ آرد عرب از وامق وعذرا بینند

اہل عجم خسرو شیریں کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ بھی سن لیتے ہیں اور اہل عرب، وامق وعذرا کی جو داستان بیان کرتے ہیں اسے بھی گوارا کر لیتے ہیں۔

نہ ستوہند اگر ہمرۂ مجنوں گردند
نخروشند اگر محمل لیلیٰ بینند

اگر مجنوں کے ہمراہ ہوں تو ملول نہیں ہوتے، محمل لیلیٰ دیکھتے ہیں تو کوئی شور نہیں مچاتے۔

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند
بادہ راشمع طرب خانۂ ترسا بینند

قشقہ کو اہل ہنود کے ہنگاموں کی رونق اور شراب کو اہل ترسا کے طرب خانوں کی

زینت قرار دیتے ہیں۔

برسم وزمزمہ وقشقہ وزنار و صلیب
خرقہ وسبحہ ومسواک و مصلیٰ بینند

برسم زمزمہ' قشقہ' زنار اور صلیب ان سب کو خرقہ، سبحہ مسواک اور مصلی کی جگہ سمجھتے ہیں۔

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دیر دو رنگ
ہرچہ بینند بعنوان تماشا بینند

اس دہر دورنگ کی نیرنگیوں پر دل نہیں دھرتے اور جو کچھ دیکھتے ہیں بطور تماشا دیکھتے ہیں۔

ہرچہ د رسونتواں یافت ' رسو یا بند
ہرچہ درجانتواں دیدہ' بہر جا بینند

جو کسی طرف نظر نہ آئے اسے ہر طرف اور جو کچھ ایک جگہ نہ نظر آئے اسے ہر جگہ دیکھ لیتے ہیں۔

ایک فکرافروز شعر

سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا
سودیست کہ مانا بہ زیاں است وزیاں نیست

ہر قطرہ جو دریا میں گم ہو گیا یہ اس کے فائدہ کی بات ہے' یہ صحیح ہے کہ وہ زیاں سے مشابہ ہے لیکن در حقیقت زیاں نہیں ہے۔ فلسفیانہ تجزیہ یہ ہے کہ ہر "جزو،، بہمہ صفت "کل،، کا نمائندہ ہے اور ایک قطرہ بھی دعوی "انا البحر،، کر سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ فرد کا اجتماعیت سے وابستہ رہنا اس کے حق میں مفید ہے۔ یہ ایک قومی نقطہ نظر ہے کہ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال نے قدم قدم مرزا سے اکتسابِ فیض کیا ہے مذکورہ شعر بھی مرزا کے شعر ہی کا خوبصورت عکس ہے۔

ایک پُر بہار تصورِ حیات

پیمانہ رنگست دریں بزمِ بگردش
ہستی ہمہ طوفانِ بہاراست و خزاں ہیچ

زندگی کا کتنا دل آویز اور خوبصورت تصور ہے کہ بزمِ حیات میں رنگ کا ایک پیمانہ رنگ بکھیر رہا ہے اور ہستی میں بہاروں کا طوفان آیا ہوا ہے' رہی خزاں تو اس کا تو کہیں وجود ہی نہیں۔ نگاہ حسن شناس ہو تو جسے خزاں کہتے ہیں اس میں بھی ہزار حسن چھپے ہیں یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جس کے بعد زندگی سراپائے حُسن محسوس ہوتی ہے اور ورق گل کی طرح رنگین و شاداب نظر آتی ہے۔

تغزل اور مستقبل کا تصور

تازِ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

جب تک لوگ میرے دیوان سے سرمستِ سخن ہوں گے' یہ شراب قحطِ خریداری سے پرانی ہو کر اور زیادہ قیمتی اور سرور انگیز ہو جائے گی۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

مرزا ولی تو نہ تھے مگر ان کی اکثر پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ میرے کوکب

تقدیر کو عدم ہی میں اوج قبول حاصل ہو چکا ہے۔ میرے شعر کی شہرت میرے بعد عالمگیر ہو جائے گی۔ حالات گواہ ہیں کہ یہ پیش گوئی سو فی صد صحیح ثابت ہو چکی ہے۔

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

میرا حرف حرف مذاق فتنہ میں اثر کرے گا اور شیخ و برہمن دونوں کے لئے دستگاہ ناز ثابت ہو گا۔

مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد ندا
چاکہا ایثار جیب و پیرہن خواہد شدن

مطرب جس محفل میں بھی میرے شعر گائے گا لوگ مست ہو کر جیب و پیراہن چاک کر ڈالیں گے۔

آنکہ صور نالہ از شور نفس موزوں دمید
کاش دیدی آن نشید شوق فن خواہد شدن

شور نفس سے جو صور نالہ موزوں صورت میں بلند ہو گا تو دیکھے گا کہ وہ آواز شوق فن قرار پائیگی۔ شاعر فردا نے اپنے کلام کے بارے میں جو کچھ کہا وہ سب سچ ثابت ہو چکا ہے۔

فن شعر میں جو طرح فکر و اسلوب مرزا نے ڈالی آج وہی مسلمہ طور پر معیار فن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(چراغ ایک ہے لیکن جہاں دیکھو اسی کی روشنی ہے) ان کا دعوی تھا کہ ۔

گر ذوق سخن بہ دہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پر وین بودے

غالبؔ اگر ایں فن سخن دین بودے

آں دین را کتاب ایزدی این بودے

اگر دنیا میں ذوقِ سخن کو آئین و دستور کا مقام حاصل ہوتا تو میرے دیوان کو شہرت پردین حاصل ہوتی اور اگر فنِ سخن بھی کوئی دین ہوتا تو میرا دیوان اس کے لئے کتاب ایزدی کی طرح مقدس ہوتا۔

شعر غالبؔ بنود وحی و نگوئیم ولے

تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

شعرِ غالبؔ کو وحی تو ہم نہیں کہتے لیکن کیا اسے الہام بھی نہیں کہا جاسکتا۔

غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ کے حسنِ فکر اور جمالیات کا اظہار حرف و عبارت میں ممکن نہیں اس کا صحیح احساس صرف ذوقِ سلیم ہی کر سکتا ہے۔

غزل کی جمالیات

حسن تغزل

سخن ماز لطافت نہ پذیرد تحریر

نشود گرد نمایاں زرم توسن ما

میرا سخن اتنا لطیف ہے کہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ میرے فکر کی گرم رفتاری سے گرد تک بھی نمایاں نہیں ہوتی۔

لالہ وگل دمد از طرف مزارش پس مرگ

تا چہا در دل غالبؔ ہوس روئے تو بود

غالبؔ کے دل میں تیری دید کی کتنی ہوس تھی کہ بعد مرگ اس کے مزار کے

اطراف لالہ و گل اُگ آئے۔

از ناز دل بے ہوس ما نہ پسندید
دل تنگ شد و گفت دریں خانہ ہوا نیست

نازِ محبوبیت کی بنا پر ہمارا دل بے ہوس اس نے پسند نہ کیا دل تنگ ہوا اور کہا اس میں ہوا (ہوس) نہیں ہے۔

تو یک قطرۂ خون ترک وضو گیری و ما
سیل خون از مژہ رانیم و طہارت نہ رود

اے فقیہ تو ایک قطرۂ خون خارج ہونے پر وضو کو ساقط سمجھتا ہے اور ہم اپنی پلکوں سے خون کا سیلاب بہاتے ہیں اور طہارت زائل نہیں ہوتی۔

بے خود بوقتِ ذبح تپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست ؟

ذبح کے وقت بے خود ہو کر تڑپنا میرا گناہ لیکن دانستہ خنجر تیز نہ کرنا کس کا گناہ ہے ؟

بخود رسیدنش از ناز بسکہ دشوار است
چو ما بدام تمنائے خود گرفتار است

نازکی وجہ سے اس کا خود سے آگاہ ہونا مشکل ہے ہماری طرح وہ خود بھی تو اپنی تمنا میں گرفتار ہے۔

خوبرویاں جفا پیشہ وفا نیز کنند

غالبؔ کا حلق اور سعدی کا دشنہ دیکھئے جو کہتا ہے کہ خوبرویاں جفا پیشہ وفا کرتے ہیں۔

خیالش را بسا طے بہر پا انداز می جستم
پسندیدم بہ مستی مخمل خواب زلیخا را

اس کے خیال کی راہ میں فرش پا انداز کے طور پر بعالم مستی میں نے خواب زلیخا کا مخمل پسند کیا۔

چو صبح من بہ سیاہی بشام مانند است
چہ گویم کہ زشب چند رفت یا چند است

جب میری صبح تاریکی میں شام کی مثل ہے تو میں کیا بتاؤں کہ رات کتنی گزری اور کتنی باقی ہے؟

درازدستی من چاک ارفگند چہ عیب
زپیش دلق ورع باہزار پیوند است

میری درازدستی نے اگر دامن چاک کر لیا تو عیب کیا ہے' میری دلق ورع میں تو پہلے ہی سے ہزار پیوند ہیں۔

زبیم آنکہ مبادا نمیرم از شادی
نگویدار چہ بمرگ من آرزومند است

میری موت کا اگرچہ وہ آرزومند ہے مگر کہتا اس لئے نہیں کہ کہیں مجھے شادی مرگ نہ ہو جائے۔

دل بُرد وحق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستم گر نتواں گفت

اس نے دل لے لیا اور سچ بات یہ ہے کہ اسے دل لے جانے والا بھی نہیں کہہ سکتے' اس کی بیداد دیکھتے ہیں اور ستم گر کہنا بھی مشکل ہے۔

پہلو بشگافید و بہ بینید دلم را
تا چند بگویم کہ چناں است و چناں نیست

میرا پہلو چیر کر میرا دل دیکھو میں کہاں تک بتاؤں کہ ایسا ہے اور ایسا نہیں ہے۔

فصلے ازباب شکست رنگ انشا کردہ ام
می تواں راز درونم خواند از سیمائے من

شکست رنگ کے باب سے ایک فصل میں نے لکھ دی ہے میرا راز دروں میرے

پیشانی پر پڑھا جا سکتا ہے۔

زہے لطافت پرواز سعی ابر بہار

کہ ہر چہ در دل باد است از زمین پیداست

ابر بہار کی پرواز میں کیسی لطافت ہے کہ ہوا کے دل میں جو کچھ ہے وہ زمین سے

ظاہر ہو رہا ہے۔

ز من حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم

نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

میں اگر دینی لباس پہنے ہوئے ہوں تو مجھ سے حذر نہ کر میں در پردہ کافر ہوں اور

آستین میں بت چھپائے ہوئے ہوں۔

افتادگی نماز دل ناتوان ماست

در دسر قیام و قعود ش نہ ماندہ است

ہمارے دل ناتواں کی افتادگی ہی ہماری نماز ہے' قیام و قعود کا دردِ سر باقی نہیں رہا۔

دیدہ ور آنکہ تانہد دل بشمار دلبری

در دل سنگ بنگرد رقص بتان آذری

دیدہ ور وہ ہے جو دلبری پر دل رکھتا ہے اور سینۂ سنگ میں بتانِ آذری کا رقص دیکھ

لیتا ہے۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل

قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

ہم نے ہر سر خار کو خون دل سے آغشتہ کرکے باغبانی صحرا کا قانون مرتب

کر دیا ہے۔

راحت جاوید ترک اختلاط مردم است

چوں خضر باید ز چشم خلق پنہاں زیستن

عوام سے اختلاط ترک کرنے میں راحت جاوید ہے۔ خضر کی طرح لوگوں کی آنکھوں سے پنہاں رہ کر جینا مناسب ہے۔

خود را ز سرد مہری اسلامیان شہر
در حلقۂ پرستش آزر گرفتہ ایم

اسلامیان شہر کی سرد مہری کی وجہ سے ہم نے پرستاران آزر کے حلقہ میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔

در دام ہر دانہ نیفتم، مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

میں دانہ کے لئے دام میں نہیں پھنستا لیکن قفس اتنا بلند کردیا جائے کہ آشیانہ تک پہنچ جائے۔

تیر نخست را غلط انداز گفتہ ام
اے وائے گرنہ تیر دگر برنشاں رسد

میں نے پہلے تیر کو غلط انداز کہا ہے اُے وائے اگر دوسرا تیر بھی نشانہ پر نہ پہنچے۔

چون نیست تاب برق تجلی کلیم را
گے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد

جب برق تجلی کی تاب کلیم تک کو نہیں تو جہاں سخن میں وہ غالب آتش بیاں کو کہاں حاصل ہوسکتی ہے۔

رشک وفا نگر کہ بدعوی گہہ رضا
ہر کس چگونہ درپے مقصود می رود

فرزند زیر تیغ پدری نہد گلو
گر خود پدر بہ آتش نمرود می رود

دعوی گاہ رضا میں رشک وفا تو دیکھو کہ ہر شخص کس طرح حصول مقصد میں

سرگرم ہے' بیٹا باپ کی تیغ کے نیچے اپنا گلا رکھ دیتا ہے جبکہ باپ خود آتش نمرود سے گزرتا ہے۔

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش زرشک
حرفے کہ در پرستش معبود می رود

نخوت تو دیکھئے کہ رشک کی وجہ سے وہ بات بھی اس کے دل میں کھٹکتی ہے جو معبود کی پرستش کے لئے کی جاتی ہے۔

شادم بہ بزم وعظ کہ رامش اگرچہ نیست
بارے حدیث چنگ و نے وعود می رود

میں بزم وعظ سے خوش ہوں کہ اگر وہاں رامش ورنگ نہیں تو چنگ، نے اور عود وغیرہ کا ذکر تو ہے۔

از نالہ ام مرنج کہ آخر شد است کار
شمع خموشم و زسرم دود می رود

میرے نالہ سے غمزدہ مت ہو کہ میرا کام تمام ہو چکا ہے' میں شمع خاموش ہوں دھواں میرے سر سے اٹھ رہا ہے۔

رفت آنکہ ناز حسن مدارا طبع کنم
سر رشتہ در کف ارنی گوے طور بود

وہ بات ختم ہوئی کہ ہم حسن مدارا کی طمع کریں' رشتہ کا سرا طور پر رب ارنی کہنے والے کے کف دست میں تھا۔

مجرم مسیح رندانا الحق سرائے را
معشوق خود نمائے و نگہباں غیور بود

انا الحق کہنے والے کو مجرم نہ سمجھا جائے' معشوق خود نما تھا اور دیکھنے والا صاحب غیرت۔

نازم بہ امتیاز کہ بگزشتن از گناہ
بادیگراں زعفو وبما از غرور بود

میں اس امتیاز پر نازاں ہوں کہ گناہ سے درگزر کرنے میں دوسروں کے ساتھ عفو کا اور ہمارے ساتھ غرور کا دخل تھا۔

بدکردچوں سپہر بمن گرچہ من بدم
باید بدیں حساب بہ نیکاں شمار کرد

چونکہ میں برا ہوں اس لئے آسمان نے بھی میرے ساتھ برائی کی' اس حساب سے تو مجھے نیکوں میں شمار کرنا چاہئے۔

کوتہ نظر حکیم کہ گفتہ ہر آئینہ
نتواں فزوں زحوصلہ جبر اختیار کرد

وہ حکیم کم نظر تھا جس نے یہ کہا کہ حوصلہ سے زیادہ جبر اختیار کرنا ممکن نہیں۔

غالبؔ کہ چرخ رابہ نواداشت دور سماع
امشب غزل سرود و مرابیقرار کرد

غالبؔ جس نے آسمان کو بھی مشغول سماع کر لیا تھا اس نے غزل چھیڑی اور مجھے بے قرار کر دیا۔

نومیدی از تو کفر وتو راضی نہ بکفر
نومیدی دگر بتو امیدوار کرد

تجھ سے نومیدی کفر اور تو کفر پر راضی نہیں دوسری نومیدی نے مجھے تیرا امیدوار بنا دیا۔

غالبا زنہار بعد مابخوں ما مگیر
قاتل ماراکہ حاکم آرزومندش بود

حاکم وقت ہمارے قاتل سے قصاص کا آرزو مند ہے لیکن اے غالب ہرگز ہمارے بعد ہمارے خون کا قصاص نہ لینا۔

ستم ناسزائی گویدازلطف گفتارش

گماں دارم کہ حرف دل نشینی بعد ازیں گوید

مجھے غصہ سے ناسزا کہتا ہے لیکن اس کے لطف گفتار سے یہ گماں گزرتا ہے کہ اس کے بعد حرف دل نشینی سے بھی کام لے گا۔

کمال درد دل اصل است در ترکیب انسانی

بخون آغشتہ اند اندر بن ہر موے جانے را

ترکیب انسانی میں درد دل اصل کمال ہے کہ ہر بن مو میں ایک خون آغشتہ جان ڈال دی گئی ہے۔

نہ دارم تاب ضبط راز وی ترسم ز رسوائی

مگر جویم ز بہر ہم زبانی بیزبانے را

ضبط راز کی تاب مجھ میں نہیں مگر رسوائی کے ڈر سے ہم زبانی کے لئے کسی بے زباں کو ڈھونڈ تا ہوں۔

خوش وقت اسیری کہ بر آمد ہوس ما

شد روز نخستین سبد گل قفس ما

اسیری خوش آیند ہوئی کہ ہماری ہوس پوری ہو گئی اور پہلے ہی دن "سبد گل،، ہمارے لئے قفس بنا دیا گیا۔

حیرت زدهٔ جلوهٔ نیرنگ خیالم

آئینہ مدارید بہ پیش نفس ما

میں نیرنگی خیال کے جلوے سے حیرت زدہ ہوں میرے سامنے آئینہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود

برقند نہ برشہد نشیند مگس ما

دنیا کی لذت میں کھو جانا مناسب نہیں ہماری مکھی نہ قند پر بیٹھتی ہے نہ شہد پر۔

آوازۂ شرع از سر منصور بلنداست

ازشب روی ماست شکوۂ عس ما

آوازۂ شرع سر منصور سے بلند ہے ہماری شب روی ہی تو شکوہ عس کا سبب ہے شب کے پہرہ دار کا شکوہ ہماری شب روی کی وجہ سے ہے نہ ہم شب رو ہوتے نہ کسی پہرہ دار کی ضرورت ہوتی یعنی نعرۂ منصور مطابق شرع ہے اس سے عظمت خداوندی ظاہر ہوتی ہے۔ انا لحق نہ کہا جاتا تو عظمت الٰہی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ محافظ مجرمانہ شب روی روکنے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اس سے حکومت کا اقتدار ظاہر ہوتا ہے۔

ندانم تاچہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم

تصور کردہ ام بگستن بند نقابش را

تصور کرتا ہوں اگر بند نقاب اس کا کھل جائے تو معلوم نہیں میرے ہوش پر کیسی برق فتنہ نازل ہو۔

سوار توسن نازاست وبرخاکم گزردارد

ببال اے آرزو چندانکہ دریابی رکابش را

وہ جان محبوبی توسن ناز پر سوار ہے اور میرے مزار سے گزر کر رہا والا ہے۔ اے آرزو اتنی بلند ہو کہ تو اس کی رکاب توسن تک پہنچ جائے۔

درازی شب ہجراں زحد گزشت بیا

فدائے روئے تو عمر ہزار سالۂ ما

شب ہجر کی درازی حد سے گزر چکی اب تو آ' تجھ پر ہماری عمر ہزار سالہ نثار۔

ہمیں گداختن است آبروے ما غالبؔ
گہرچہ ناز فروشد بہ پیش ژالہ ما

غالبؔ ہمارے ژالہ کا پگھلنا ہی ہماری آبرو ہے گہر اس کے مقابلہ میں کیا ناز کرتا ہے کہ وہ پگھلتا ہی نہیں۔

بے خطر از خودی برآ لب بہ انا الصنم کشا
شیوۂ دار و گیر نیست در کنش کنشت ما

بے خوف ہو کر خود سے باہر آ' نعرۂ انا الصنم بلند کر' ہماری کنشت میں دار و گیر کی روایت نہیں ہے۔

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نہ داری بہ نگاہے دریاب

عالم آئینہ راز ہے' کیا ظاہر اور کیا باطن' غور و فکر کی تاب نہیں تو نظر ہی سے دیکھ۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہارے' شب ماہے دریاب

فرصت کو ضائع مت کر' وقت کو غنیمت سمجھ' اگر صبح بہار نہیں ہے تو چاندنی رات سے حظ اندوز ہو۔

داغ ناکامی حسرت بود آئینۂ وصل
شب روشن طلبی روز سیاہے دریاب

آئینہ وصل ناکامی حسرت کا داغ ہوتا ہے' رات کو جگمگاتا دیکھنا چاہتا ہے تو روز سیاہ کا بھی تحمل کر۔

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

اگر معنی تک پہنچنا مشکل ہے تو جلوہ صورت ہی کیا کم ہے' زلف کا خم دیکھ طرف

کلاہ کی شکن دیکھ۔

خیز و بیراہہ روی راسر راہے دریاب
شورش افزائگہِ حوصلہ گاہے دریاب

اٹھ اور بیراہہ روی کا نظارہ سر راہ دیکھ' شورش افزانگاہ حوصلہ انگیز پیدا کر۔

پیراہن از کتان و دمادم زسادگی
نفریں کند بہ پردہ دری ماہتاب را

کتان کا لباس محبوب کے زیب تن ہے مگر سادگی کے ساتھ چاندنی کی پردہ دری پر نفرین کرتا ہے (چاندنی میں لباس کتاں تار تار ہو جاتا ہے)۔

نازم فروغ بادہ زعکس جمال دوست
گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

مجھے ناز ہے کہ عکس جمال دوست سے شراب کو ایسا فروغ ملا ہے گویا جام میں آفتاب نچوڑ دیا گیا ہے (اک زمانہ میں شراب کا نام آفتاب بھی تھا)۔

تکلف بر طرف لب تشنۂ بوس و کنار ستم
زراہم باز چین دام نوازش ہاے پنہاں را

تکلف بر طرف میں بوس و کنار کا تشنہ لب ہوں' میرے راستے سے ایک بار پھر اپنی پنہاں نوازشوں کا جال اٹھالے۔

غالب بریدم از ہمہ خواہم کہ زیں سپس
کنجے گزینم و پرستم خداے را

غالب میں نے سب سے تعلق توڑ لیا اور یہ چاہتا ہوں کہ کسی گوشہ میں بیٹھ جاؤں اور خدا کی پرستش کروں۔

ہائے پرکاری ساقی کہ بہ ارباب نظر

مے بہ اندازہ و پیمانہ بہ انداز دہد

کیا پرکاری ہے ساقی کی کہ ارباب نظر کو شراب اندازہ سے دیتا ہے اور پیمانہ ادائے ناز سے۔

چون نہ نازد سخن از مرحمت دہر بخویش

کہ بردعرفی و غالب بعوض بازدہد

کلام اپنی مرحمت دہر پر کیوں ناز نہ کرے کہ عرفی تک پہنچتا ہے اور پھر غالب کو واپس مل جاتا ہے۔

رباعیات

آن مرد کہ زن گرفت دانا نبود

از غصہ فراغتش ہمانا نبود

دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو

نازم بخدا چرا توانا نہ بود

یہ مرزا کا اپنا تجربہ ہے جو اس شوخ مزاج شاعر نے بیباکی سے بیان کر دیا ہے کہ وہ شخص جس نے عورت کو شریک حیات کیا، عقل مند نہیں ہوتا اسے عمر بھر غصہ سے نجات نہیں ملتی میں خدا پر ناز کرتا ہوں کہ دنیا میں اس کا گھر موجود ہے مگر اس میں کوئی عورت نہیں ہے پھر وہ توانا کیوں نہ ہوگا؟

آن خستہ کہ در نظر جز یارش نیست

با سود و زیان خویش کارش نیست

طالب ز طلب رہیں آثارش نیست

ہرچند حنا برگ دہد بارش نیست

وہ خستہ دل جس کی نظر میں دوست کے سوا اور کچھ نہیں اپنے سود و زیاں سے بھی اسے کوئی تعلق نہیں طالب آثار کا رہین منت نہیں ہوتا نہ کے پتوں پر اس کا رنگ و روپ بار نہیں ہوتا۔

در باغ مرادما زبیداد تگرگ
نے نخل بجاے ماند نے شاخ نہ برگ
چوں خانہ خراب است چہ نالیم ز سیل
چون زیست وبال است چہ ترسیم ز مرگ

باغ مراد میں بیداد ژالہ باری سے نہ کوئی درخت بچا نہ شاخ نہ برگ' جب گھر ہی برباد ہو گیا تو سیلاب پر کیا رونا؟ جب زندگی وبال ہے تو پھر موت کا بھی کیا ڈر؟

یارب بہ جہانیاں دل خرم دہ
در دعوئ جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نہ داشت باغش از تست
آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

اے پالنے والے دنیا والوں کو خوشی و خرمی عطا کر' جنت کے دعوی کی جگہ آشتی باہم کا ذوق ارزانی فرما' شداد کے کوئی بیٹا وارث نہ تھا اس کا باغ تیرا ہے اس باغ کو بنی آدم ہی کے حوالہ کر دے۔

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
گزار مراکہ من خیالے دارم
با حسرت عیش ہاے ناکردۂ خویش

اے خدا تو نے سرمایہ کم اور اس کی خواہش زیادہ دی ہے' باز پرس کے دن مجھے معاف کر دینا کہ میں عیش ہاے ناکردہ کی حسرت میں مبتلا ہوں۔

راہیست زعبد تاحضور اللہ
خواہی تو دراز گیر وخواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانہادارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

بندے سے خداتک ایک راستہ ہے تو چاہے اُسے دراز کرلے یا مختصر، یہ کوثر وطوبی کے جو نشانات ہیں یہ سرچشمہ اور سایہ درمیان راہ ٹھہرنے کے لئے ہیں منزل نہیں ہیں۔

آں راکہ عطیۂ ازل در نظر است
ہرچند بلا بیش طرب بیشتر است
فرق است میان من وصنعاں در کفر
بخشش دگر و مزد عبادت دگر است

عطیۂ ازل جس کی نظر میں ہے اس کے لئے ہرچند کہ بلا زیادہ لیکن طرب اس سے بھی زیادہ ہے میرے اور صنعان کے درمیان کفر میں یہ فرق ہے کہ میرے نزدیک بخشش اور چیز ہے اور صلۂ عبادت دوسری چیز۔

چرگرکہ ز زخمہ زخم برچنگ زند
پیداست کہ ازبہرچہ آہنگ زند
درپردۂ ناخوشی خوشی پنہاں است
گاذر نہ زخشم جامہ برسنگ زند

سازندہ جو زخمہ سے چنگ پر ضرب لگاتا ہے ظاہر ہے کہ کسی غرض سے آواز پیدا کرتا ہے۔ ناخوشی کے پردہ میں خوشی چھپی ہے گاذر (دھوبی) کسی غصہ سے کپڑا پتھر پر نہیں پٹکتا اس کا ایک خوشگوار مقصد ہوتا ہے۔

اے آنکہ براہ کعبہ روے داری
نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری

زین گونہ کہ تند می خرامی دانم

درخانہ زن ستیزہ خوئے داری

اے شخص تو جو کعبہ کی طرف جارہا ہے مجھے ناز ہے کہ تو بہتر آرزو رکھتا ہے اور اس قدر جو تو تیز تیز جارہا ہے اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تیرے گھر میں کوئی لڑاکا عورت ہے۔

اے آنکہ تراست بہ درمان من است

منعم مکن ازبادہ کہ نقصان من است

حیف است کہ بعد من بہ میراث رود

ایں یک دو سہ خم کہ در شبستان من است

اے شخص تجھے جو میرے علاج کی فکر ہے مجھے شراب نوشی سے منع مت کر کہ اس میں میرا نقصان ہے۔ مجھے افسوس ہوگا کہ دو یا تین خُم جو میرے شبستان میں ہیں وہ میرے بعد میراث میں چلے جائیں۔

غالب روش مردم آزاد جداست

رفتار اسیران رہ و زاد جداست

ماترک مراد را ارم میدانیم

واں باغچۂ ضبطی شداد جداست

غالبؔ مرداں آزاد کی روش اور ہے اور راہ اور زاد سفر کے اسیروں کا راستہ اور، ہم ترک مراد کو ارم سمجھتے ہیں شداد سے ضبط کیا ہوا باغچہ (جنت شداد) کچھ اور ہے۔

درعالم بے زری کہ تلخ است حیات

طاعت نتواں کرد بامید نجات

اے کاش زحق اشارت صوم وصلوٰت

بودے بوجود مال چون حج و زکات

عالم بے زری میں کہ زندگی تلخ ہے نجات کی امید میں طاعت دشوار ہے۔ اے

کاش اللہ کی طرف سے صوم وصلوات کے لئے بھی مال وزر کی ایسی ہی شرط ہوتی جیسی حج اور زکات کے لئے مقرر ہے۔

قطعات

کلیات غالبؔ فارسی کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا غلام رسول مہر "مرزا نے بلا قصد اپنی زندگی کے مختلف اہم واقعات نہایت پُرتاثیر انداز میں نظم کردئے ہیں' کوئی چاہے تو محض کلیات سامنے رکھ کر اتنے اشعار منتخب کر سکتا ہے جو مرزا کی خود نوشت سوانح عمری کا سرمایہ بن جائیں۔

مولانا مہر کا خیال درست ہے لیکن فارسی کلام سے بیگانگی کے موجودہ دور میں کون یہ مفید کام انجام دے سکتا ہے۔ بہرحال من جملہ چھیاسٹھ قطعات کے چند ایسے قطعات پیش کئے جارہے ہیں جن میں مرزا کے احساسات اور واقعات موجود ہیں۔ تمام قطعات پر اگر تحقیقی کام کیا جائے تو بلاشبہ ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اصل فارسی قطعات مع ترجمہ لکھے جائیں تو ضخامت کتاب اندازہ سے بہت زیادہ بڑھ جانے کا اندیشہ ہے' اس لئے چیدہ چیدہ چند قطعات کے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جارہا ہے کہ اصل مقصد غیر فارسی داں طبقہ کو مرزا کے افکار و تصورات سے روشناس کرانا ہے۔

قطعہ دربیاں حسب ونسب (۱)

غالبؔ ازخاک پاک تورانیم
لا جرم درنسب فرہ مندیم

ہمارا تعلق خاک پاک توران سے ہے' بلاشبہ ہم فرہ مند ہیں ہم ترک ہیں اور ترک قوم سے ہمارا پیوند ہے' ہم ایبک ہیں اور ماہ تمام سے بھی دس گنا زیادہ روشن ہیں' پیشۂ آبا کشاورزی اور وطن سمرقند تھا۔ ہم فیاض قدرت کے حقیر شاگرد اور عقل کل کے لایق

فرزند ہیں تاب و تابش میں برق کے ہم نفس اور بخشش میں ابر کی مثل ہیں۔ اپنی تلاش و جستجو میں کامیاب اور جو معاش حاصل نہیں اسی میں خوش ہیں۔ ہم خود پر روتے اور زمانہ پر ہنستے ہیں۔

شوخی فکر (۲)

ساقی چونکہ میں پشنگی اور افراسیابی ہوں تو بھی واقف ہے کہ میرا گوہر اصل خاندان جم سے ہے۔ جم کی میراث شراب تھی اس لئے وہ مجھے دے قبل اس کے کہ بہشت جو میراث آدم ہے وہ مجھے ملے۔

صلۂ فن نہ ملنے کا شکوہ (۳)

میں وہ ہوں کہ بزم میں میرے قلم کی آواز نویں آسماں تک کو رقص میں لے آتی ہے' رضوان جنت میرے ریزۂ قلم کو تبرک سمجھ کر اشجار فردوس کے ساتھ پیوندکاری کرتا ہے۔ میں اپنی فکر کا جو تیر چلاتا ہوں وہ وحی کی رہ گزر میں متجس ہوتا ہے۔ اس آرائش گفتار کے باوجود جو میں نے ظاہر کی' میری جبین بخت سے آثار تکدر نہیں جاتے' صلۂ مدح مقدر نہیں' قبولیت غزل قسمت میں نہیں' دل ہنگامہ گزیں کو کس بات سے تسکین دوں' بانگ زنی کا معاوضہ تو حافظ کو دے دیا میرے لئے کیا بچا۔

منکران شعر اور حسد (۴)

منکران شعر کو حاسد کیسے نہ کہوں' ان کے لئے تو یہ خیال ہی موجب فخر ہے کہ وہ خود کو میری مثل اور مجھے اپنی مثل سمجھتے ہیں' اسی بنیاد پر سوز و ساز میں گرفتار ہیں' خود پر اعتماد کرتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ امتیاز بھی تو بہر حال کوئی چیز ہے' پہاڑ کو رفعت اور دریا کو نشیب دیا گیا ہے' مرتبۂ احباب دانستہ کم کروں تو کافر' میرا شیوہ محبت اور عرض نیاز ہے۔ یہ دم کشی جو میں نے کرلی ہے' یہ عجز نطق کے سبب نہیں بلکہ خود نمائی سے میں نے پرہیز کرلیا ہے۔

اعتراف توارد (۵)

ہزار معنی سرجوش میرے کلام میں ہیں' اہل ذوق کا دل گواہ ہے اگر پیش رفتگان کے کلام سے میرے یہاں کوئی توارد واقع ہو گیا ہے تو یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ خوبی آرائش غزل سے لی گئی ہے ایسا کرنا میرے لئے موجب ننگ اور اس کیلئے موجب فخر جو فکر رسا کی کوشش سے اس مفہوم تک پہنچا گمان توارد غلط ہے یہ یقین کر لینا چاہئے کہ سارق میری ہی متاع نہاں خانۂ ازل سے چرا کر لے گیا ہے۔

مضامین شعر کسی کی جاگیر نہیں (۶)

غالبؔ موجودہ زمانہ میں جسے دیکھو غیر کا مضمون اور اس کے اپنے الفاظ زبان پر ہیں۔ مضمون شعر نہ کوئی چیک ہوتا ہے نہ تمسک جس پر نہ دستخط ہوتے ہیں نہ مہر ہوتی ہے نہ نام ونشان وہ ایک نوٹ ہوتا ہے کہ جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہے۔ یہ سرمایہ جس کا ہوتا ہے وہ روتا ہے کہ اس کا قیمتی خزانہ رائگاں ہو۔ اس کے خیال کی دست برد سے کسی کو نجات نہیں ہے چاہے زمانہ ماضی کا ہو یا حال کا' جس مضمون کو جو کوئی حسن ادا سے پیش کرتا ہے گویا بزم اہل سخن میں وہ اسی کا ترجمان ہے' میرے سوادِ سخن تک کوئی نہیں پہنچتا کیسا ہی خوش خوان ہو اور انجمن اس کی مدح خوان ہو۔

فارسی بیں تا بہبنی نقش ہائے رنگ رنگ (۷)

اے شخص تونے شہنشاہ سخن رس کی بزم میں دعویٰ کیا ہے کہ پرگوئی میں کون ہے جو میرا ہمسر ہے۔ تونے ٹھیک کہا تجھے معلوم ہے یہ کوئی طنز نہیں کہ میرا نغمہ ڈھول کی آواز سے کمتر ہے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں کہ میرا دیوان ریختہ دو جزو کا ہے اس لئے کہ وہ میرے "نخلستان فرہنگ،، کا برگ دژم (پژمردہ) ہے۔ فارسی دیکھ کہ نقش ہائے رنگ رنگ نظر آئیں مجموعۂ اردو کو چھوڑ وہ میرا بے رنگ مجموعہ ہے۔ فارسی دیکھ کہ تو سمجھ سکے کہ میں اقلیم خیال میں مانی اور ارژنگ ہوں اور وہ نسخہ میرا ارتنگ ہے۔ جب تک زنگ باقی ہو آئینہ

کہاں چمکتا ہے میں آئینہ شفاف ہوں یہ جوہر ہے اور وہ میرا زنگ ہے۔ خدا جانتا ہے کہ بنائے شکوہ مہر و وفا ہے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میری بات کسی پرخاش کی بنا پر ہے۔ تو دوست تھا اس لئے شکوہ کیا اور تیرا جرم بھی کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر یہ بیداد میرے دل تنگ ہی کی ہے۔ میرا بخت ناساز ہے اور خوئے دوست ناساز تر۔ اب دیکھئے کیا پیش آئے کہ خود اپنے مقدر سے ہی جنگ ہے۔ دشمنی کے لئے ہم فن ہونے کی شرط ہے اور تو جانتا ہے کہ ہم فنی درمیان نہیں ہے تیرے یہاں وہ نغمہ اور ساز نہیں ہے جو میرے چنگ میں ہے۔

مذکورہ قطعہ کا شان نزول یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے دربار سے دیرینہ تعلق تھا' بہت ذی علم تھے قصائد کی تشبیبیں ان کی ہمہ دانی کی دلیل ہیں' پر گوئی میں جواب نہ تھا لیکن وہ ناظم تھے اور ان کا امتیاز خاص قصیدہ نگاری تھا وہ بھی روایتی انداز کا مگر انہیں اپنی علمیت پر ناز تھا' ہو سکتا ہے انہوں نے دربار شاہی میں یہ دعویٰ کیا ہو کہ ان جیسا پر گو کوئی نہیں اور مرزا تک یہ بات کسی نے پہنچادی ہو' مرزا شاعر تھے۔ فقط ناظم نہ تھے رفعت فکر اور معنی آفرینی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ذوق کا دعویٰ "انا و لاغیری" سنا ہو جس کے بعد مذکورہ قطعہ میں اس کا جواب دیا گیا۔

حرف طنز (۸)

اگر تجھے فرصت میسر ہو تو شراب' مغنی' ساقی اور سرود کو غنیمت سمجھ لیکن اس قوم میں ہرگز شامل نہ ہو جو خدا کو سجدوں سے اور نبیؐ کو درود سے فریب دیتی ہے۔

دین داری اور شوخی (۹)

اے زاہد زشت خو مجھے زندقہ سے نسبت دے کر بجلیاں مت گرا۔ تو کہتا ہے کہ کلام مجید کی طرف رجوع نہیں ہوں اس گفتگو کی کلفت سے میرا دل تاریک ہو گیا۔ قرآن مجید حق ہے اور از روئے اعتقاد کلام الٰہی کی عزت میں مجھے غلو ہے' میری نظر میں اس صحیفہ

مشکیں رقم کا ہر صفحہ روئے حسین سے ' بھی زیادہ حسین ہے شیطان دشمن ہے لیکن اس کا ہر ورق مجھے دشمن کے خوف سے امان بخشتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کلام حق میں امر بھی ہے اور نہی بھی' مجھے اس جوئے آب سے نہی کی حد تک سیرابی میسر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ جنگ جو فلک مجھے غم وتعب اور پیچ وخم میں سرگشتہ رکھتا ہے۔ سرچشمہ حواس سے گرد اٹھتی ہے اور حافظہ کے سبو میں نہی تک باقی نہیں رہی۔ مجھے نہی سے "لا تقربوا الصلوٰۃ،، اور امر سے "کلوا واشربوا،، یاد ہے۔

محرم سرائے سرور سے مکالمہ (۱۰)

ایک روز ساقی بزم آگہی نے میرے پیالے میں شراب ڈال دی جب اس شراب کا اثر دماغ پر ہوا تو میں ترکتاز اور غم والم سے محفوظ ہو گیا اسی حریفانہ سرخوشی میں میں نے بے اختیار اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ اے "محرم سرائے سرور،، کچھ پوچھنا خلاف ادب نہیں۔ بولا دعوی وجود کے بارے میں کچھ بتا۔ اس نے کہا میری طریقت میں کچھ کہنا کفر ہے' میں نے پوچھا یہ "نمود اشیا" کیا ہے ؟ کہا افسوس اس کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں۔ میں نے کہا مخالفین سے کس طرح نپٹوں ؟ کہا صلح کی بنیاد ڈال۔ میں نے دریافت کیا یہ حب جاہ و منصب کیا ہے ؟ کیا وہ جان ہے اور یہ دنیا جسم اور یہ بنارس کیا ہے ؟ کہا ایک محبوب ہے گل چینی میں مصروف اور یہ عظیم آباد کیسا ہے ؟ کہا فضائے چمن سے زیادہ رنگین میں نے سوال کیا سلسبیل تو بہت خوب ہے' کہا "سوہن" سے زیادہ خوشتر نہیں' پھر کلکتہ۔ کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا اسے اقلیم ہشتم کہنا مناسب ہے میں نے پوچھا وہاں انسان ملتے ہیں ؟ کہا ہر دیار اور ہر فن کے۔ سوال کیا کہ یہاں کیا شغل مناسب ہوگا ؟ کہا یہاں ہر کسی سے ڈرتے رہنا۔ سوال کیا یہاں کام کیا کرنا چاہئے ؟ کہا شعر وسخن سے ترک تعلق کر لینا چاہئے۔ میں نے کہا یہ ماہ پیکر کیسے ہیں ؟ کہا کشور لندن کے شعلہ رو ہیں۔ میں نے پوچھا ان کے سینہ میں دل ہے ؟ کہا ہے مگر فولاد کا ہے۔ میں نے کہا میں انصاف حاصل کرنے آیا ہوں' اس نے

جواب دیا جا اور سر پتھر سے مت ٹکرا۔ میں نے معلوم کیا اب میرے لئے کیا مناسب ہے؟ کہا دونوں عالم پر آستین جھاڑنا۔ میں نے پوچھا پھر طریق نجات کیا ہے؟ اس نے کہا 'غالب زیارت کربلائے معلی'۔

مذکورہ بائیس ابیات کے قطعہ میں بیس سوالات ہیں جو ایک مفروضہ "محرم سرائے سرور" سے کئے گئے ہیں۔ سوال اور جواب دونوں مرزا کے ذہن وفکر کا عکس پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر سبھی قطعات عرفانِ غالب کے لئے اہم ہیں لیکن مذکورہ قطعہ سے تاریخ اور سوانح نگاری میں خاصی امداد مل سکتی ہے کہ ایک اعتبار سے یہ سفر کلکتہ کی روئیداد ہے۔

ترجمۂ تاریخ تفسیر

صفدر حسن خاندان مودود کے چشم وچراغ ہیں مجھے ان کے نژاد پر فخر ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت مودود تک اور ان کے واسطہ سے حضرت علی نقی امام دہم تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے ایک مصحف آراستہ کیا اور اس میں تمام علوم یعنی رسم الخط 'قرأت، تجوید، ترجمہ، شان نزول، آیات ناسخ ومنسوخ، حدیث، فقہ، سلوک، تعداد حروف وغیرہ کی فہرست مرتب کی اس کے علاوہ اس تفسیر میں، شرح فواید، قصص، نقطہ ہائے راز اور ہر وہ دانش ہے جو کسی بھی نام سے موسوم ہو، علم خداشناسی اور اسرار معنوی کے علاوہ جو مقام جہاں موزوں تھا اس کی تفسیر ہے۔ اس کے حسن نگارش کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وقت نگارش گوہر گرانمایہ بکھیر دے ہیں، طایر نگاہ کے لئے نقطہ اور خط کا جال بچھا کر دانے ڈال دے گئے ہیں تاکہ نقطہ سے خال رخ خوباں خجل ہوں اور خط سے بنفشہ زار تازگی حاصل کرے، الفاظ کے دائروں پر نظر کی جائے تو زلال خضر کے ہزاروں جام نظر آئیں جس جگہ "و اقتلوا" کا ترجمہ ہے وہاں نوک خامہ دم شمشیر بن گئی ہے۔ جہاں معنی "لا تقنطوا" کا موقع ہے وہاں سنبل فردوس کی خوشبو مشام جاں تک پہنچتی ہے۔ میں نے چاہا کہ اس دل فروز تحریر کی ستائش کروں لیکن میری ہمت اس کے اظہار وصف میں فائز المرام نہ ہوئی 'اگر عقل کام

کر سکتی تو اسپ خامہ گوہرین ستام ہو جاتا بالجملہ ایسا جامع مصحف اس فلک آبگینہ فام میں کہیں نہ ہوگا۔ اس صحیفہ گہر آگین کو صفدر حسن میرے پاس لائے اور کہا کہ اس کی تاریخ اختتام ''ختم الصحائف،، ۱۲۶۰ھ ہے' میں نے یہ سوچ کر کہ باعتبار فن سخنوری اگر تاریخ بصورت نظم نہ ہو تو خوبصورت نہیں ہوتی اس لئے اس خزانہ کی بنیاد یہ قطعہ قرار دیا۔ والسلام۔

ہجویات

ہجو کا ادب میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں لیکن اس ذیل میں جو کچھ موجود ہے تاریخ ادب میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ہجو کے کچھ فنی پہلو بھی ہوتے ہیں بالخصوص اس صورت میں کہ ہجو نگار سودا اور غالبؔ جیسے اساتذۂ سخن ہوں۔ مرزا نے بھی ہجویات لکھی ہیں لیکن کسی کا نام نہیں لیا۔ سوانح نگاروں نے بھی نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اخلاقی قدروں کے اعتبار سے ٹھیک ہی ہوا۔

مغرور کی مذمت

اے شخص تو چاہتا ہے کہ میں تیرا صادق الولا دوست بن جاؤں' اگر تو محبوب ہوتا تو جان و دل تجھ پر نثار کر دیتا۔ شاعر ہوتا تو تیرے پیروں پر اپنی آنکھیں ملتا، بادشاہ ہوتا تو تیری مدح میں موتی پروتا' تو ان میں سے کوئی نہیں تو میں بلا ضرورت ہرزہ سرائی کیوں کروں؟ یہ بھی ایک بہانہ ہے کہ میں تیرا ناصح مشفق ہوں لیکن تو مال میں مغرور اور میں تیری اس ادا سے ناخوش' تو جو کچھ کرتا ہے وہ سیم و زر کا فساد ہے' وائے ہو مجھ پر اگر میں تیری جگہ ہوں اگر میرا خدا تیرا خدا ہوتا تو تجھے سیم و زر ہرگز نہ دیتا۔

آدم کو شیطان کے سجدہ نہ کرنے کی شوخ تاویل

تو نے میرا گھر برباد کرنے کی ایسی کوشش کی ہے کہ آسمان نے ہنگامۂ عالم برپا کرنے میں بھی ایسی نہ کی تھی۔ میں نے تیری ہجو میں جو نکتہ بیان کیا ہے اسے تو اپنے لئے

نہ سمجھ میں خود اس سے خوش نہیں میں نے استاد کی ایک بیت دیکھی اس سے تسکین نہ ملی، نہ وحشت کم ہوئی، تجھ جیسا نا قابل انسان شیطان نے صلب آدم میں دیکھ لیا تھا اس سبب سے اس نے آدم کو سجدہ نہ کیا ماشاء اللہ صلب آدم میں تیرا ہونا اک تہمت ہے۔ میں نے جس کسی سے بھی یہ بات کہی اس نے باور نہ کیا۔

لطیفہ

ایک شاعر بے عدیل کا قول ہے

اگر خدا یہ جانتا کہ تو ابھی تک زندہ ہے تو وہ عزرائیل کے چہرہ پر مکے مارتا

مثنوی چراغ دیر

اصناف سخن میں مثنوی اک ایسی صنف ہے جس میں شاعر کی فکر ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ مثنوی چراغ دیر مرزا کی ایسی شاہکار مثنوی ہے جس کی مثال فارسی ادب میں بمشکل ہی مل سکتی ہے، جیسا حسین اور دل کش نام ویسی ہی طرب انگیز اور معنی خیز مثنوی، منظر نگاری اور "عرفان نفس،، کے جلیل مقصد کا دل کش امتزاج "ز دانش کار نکشاید جنوں کن،، کا انقلاب انگیز مشورہ، پہلی بار اسی مثنوی میں دیا گیا ہے، اس اعتبار سے جہان معنی میں اس کا مرتبہ بھی کافی بلند ہے۔

یہ مطبوعہ مضمون انتیس سال بعد اس لئے شامل کتاب کیا جا رہا ہے کہ اس میں مثنوی چراغ دیر پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے امید ہے کہ قارئین کے لئے اس کی بار دگر اشاعت بار خاطر نہ ہوگی

اردو کے مشاہیر اہل قلم نے غالب اور غالبیات سے متعلق جو کچھ سپرد قلم کیا ہے وہ بیشتر اسی اردو کلام تک محدود ہے جو اگرچہ بجائے خود ادب اردو کا سرمایۂ افتخار ہے لیکن خود شاعر نے اپنے نخلستان کا برگ ذم ٹھہرایا ہے، فارسی کلام جس کے بارے میں اس کا مشورہ ہے کہ۔

فارسی بین تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس سے اعراض برتا گیا ہے اور اب منزل یہ آگئی ہے کہ بعض ارباب ادب فارسی شاعری کو اردو ادب کا جزو تک خیال نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک وقت غالبؔ کی زندگی میں ایسا بھی آیا جب اسے اپنے اردو کلام کی عظمت اور اثر آفرینی کا شدت سے احساس ہوا اور اس نے دعوی کیا کہ ؂

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ صاحبان ذوق اور اہل قلم غالبؔ کے اس فارسی کلیات کو جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں قصائد اور مثنویوں کے علاوہ ڈھائی سو سے زائد ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جن کا جواب خسرو کے علاوہ کسی ہندوستانی فارسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا' اسے یکسر نظر انداز کردیں۔ چراغ دیر پر کچھ لکھنے کا مقصد مرزا کی فارسی شاعری کے متعلق اردو اہل قلم حضرات کی معنی خیز خاموشی کو توڑنا ہے۔ خدا کرے کہ یہ شکوہ صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

غالبؔ نے کل گیارہ مثنویاں فارسی زبان میں لکھی ہیں جو کم وبیش دو ہزار ابیات پر مشتمل ہیں لیکن یہ مثنویاں رواج عام کے مطابق صرف حسن وعشق کی روایات رنگین تک محدود نہیں' ان میں سے اکثر کے موضوعات عام مثنویوں سے مختلف اور شاعر کی انفرادی فکر کی آئینہ دار ہیں۔ چار مثنویاں تہنیت، تقریظ یا دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہیں' ایک مثنوی "باد مخالف،، حادثات کلکتہ کی یادگار ہے' دو مثنویاں "بیان نموداری شان نبوت وولایت" اور "ابر گہر بار،، مذہبی عقیدت کا پرتو ہیں' ان میں سے آخر الذکر ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ یہ ایک ہزار ابیات پر مشتمل ہونے کے باوجود نا تمام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مثنوی شاہنامہ کے انداز پر شروع کی گئی تھی مگر نا معلوم وجوہات کی بنا پر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

تین مثنویاں "درد و داغ"، اور "رنگ و بو"، اگرچہ عام طرز کی ہیں لیکن ان کا بھی اخلاقی اور فنی پہلو عام مثنویوں سے بڑی حد تک ممتاز ہے۔ ان ہی مثنویوں میں ۱۰۸ شعر کی ایک شاہکار مثنوی "چراغ دیر" ہے۔ یہ مثنوی چونکہ غالب کے قیام بنارس کی ایک حسین یادگار ہے' اس لئے اس کو بنارس کی تمام تر روایات کے ساتھ "چراغ دیر" کا خوبصورت نام دیا گیا ہے اس مثنوی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تقلید دشمن شاعر نے کوئی مفروضہ کہانی بیان کر کے صرف تصورات کی محفل نہیں سجائی بلکہ قیام بنارس کے موقع پر وہاں کے حسین اور دل آویز ماحول کی پوری قوت فن کے ساتھ منظر نگاری کی ہے۔ منظر کی عکاسی کے لئے مثنوی کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ صرف اسی صنف سخن میں واقعات و مشاہدات کا تفصیلی اظہار کی وہ آزادی میسر آتی ہے جو بڑھتے ہوئے جوش طبع کا احصاء کر سکے۔

مثنوی کا آغاز شکوۂ احباب سے ہوا ہے۔ اس کے بعد بنارس کی جمالیاتی رنگینیوں پر زور طبع صرف کیا گیا ہے۔ منظر نگاری سے حرف مطلب کی طرف گریز کا پہلو بھی بہت دل آویز ہے ایک شب کسی "دانندۂ اسرار" سے ملاقات ہونے پر دنیا کے اخلاقی زوال کا شکوہ کیا گیا ہے اس کے جواب میں مرد بزرگ نے جو مشورہ دیا ہے وہی مثنوی کا نقطۂ عروج ہے۔ مرد بزرگ نے انسان کو خود اعتمادی اور ثبات عزم و عمل کا وہ جرأت آفریں پیغام دیا ہے جو شاعری کو جزو پیغمبری ٹھہراتا ہے۔ یہ پیغام اتنا ولولہ انگیز اور ہمت آفریں ہے کہ اس سے ذہنی توانائی اور تہذیب نفس حاصل کرنے کے مواقع میسر آسکتے ہیں۔ مثنوی کا ماحول خالص ہندوستانی ہے۔ ایک ہندوستانی شہر اور اس کے نظاروں کی حکایت رنگیں' شاعر نے اس مثنوی میں حسن بنارس کو واقعاتی اور مشاہداتی اہمیت دے کر نہ صرف اپنے ذوق جمال کی تسکین ہی کی ہے بلکہ منظر نگاری کے فن کو بھی معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔

بنارس آب رود گنگا کا ایک قدیم، خوبصورت اور مقدس شہر ہے اک ایسا شہر جو آج بھی اپنے نظر نواز نظاروں سے غالب کے تاثرات کی پوری طرح تائید کر سکتا ہے' جس کی حسین صبح کا تصور آج بھی نظارہ پرستوں کے لئے جنت نگاہ ہے کل کا بنارس اور آج کا

واراناسی وہ شہرۂ آفاق مقام ہے جہاں کی سرزمین مشہور ایرانی شاعر شیخ علی حزیں کی مدت العمر دامن کش رہی' جہاں حزیں نے پیغام دوست سنااور فیصلہ کر دیا کہ۔

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

شیخ نے جو کچھ کہا کر دکھایا۔ زندگی بھر اپنے وطن اصفہان جانے کا نام نہ لیا اور جس طرح مشہور فارسی شاعر برہمن لاہوری شہید حسن بنارس ہو کر اس کی خاک کا ایک جزو ہو گیا' اسی طرح حزیں نے بھی خود کو اسی خاک حسن انگیز کے سپرد کر کے احساس جمال کو جاودانی بنادیا۔ حزین کے لوح مزار کا قطعہ اس کے شدید تاثر اور خاک بنارس سے والہانہ شیفتگی کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ دل از دوست پیغامے شنید اینجا
حزین ازپاے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بربالین آسائش رسید اینجا

حزیں کا بالین آسائش غالبؔ کی نگاہ حسن آشنا میں کیوں نہ کھب جاتا' مرزا نے بنارس کو اتنا پسند کیا کہ اسے "بہشت خرم،، اور "فردوس معمور،، قرار دیا،، بہار آئین،، سواد دلنشین،، بتایا "زیارت گہ مستاں،، اور "کعبہ' ہندوستاں،، کہہ کر اس کے تقدس اور رنگینیوں کا اعتراف کیا' یہاں تک کہ دھلی واپس جانے کے بعد ایک خط میں لکھا:۔

"اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا،، گویا ارادہ غالبؔ کا بھی یہی تھا کہ رسم برہمنؔ و حزیںؔ تازہ کریں لیکن حالات کی نامساعدت مانع ہوئی' بنارس سے غالبؔ کی یہ شیفتگی اس اعتبار سے اور بھی قابل توجہ ہے کہ اس نے کسی بھی دوسرے شہر کے بارے میں اس طرح یکسوئی کے ساتھ زور طبع صرف نہیں کیا۔ سفر کے بارے میں اور ہندوستان کے ان شہروں کے متعلق جو مرزا کی نظر سے گزرے اس کے تاثرات نظم و نثر موجود ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس محل پر ان تاثرات نظم ونثر کا بھی جائزہ لیا جائے تاکہ اس خصوص میں غالب کے تاثرات فکر ونظر کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکے۔ مرزانے ہر سفر اگرچہ معاشی ضرورتوں کی بنا پر کیا لیکن کہیں بھی مطالعہ حسن اور فن کی طرف سے بے توجہی نہیں برتی۔ بھوپال میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی تو بے اختیار کہا۔

پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

لکھنؤ میں کوئی غیر معمولی کشش نظر آئی تو بے تکلف کہا۔

لکھنو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس میسر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

ایک قصیدہ میں مزید صاف گوئی سے کام لیا۔

لکھنؤ دام نشاطے سر راہم گسترد

بے خود ازولولہ شوق پرِ افشاں زخم

کلکتہ کے بارے میں تاثرات دوچند اگانہ بلکہ متضاد صورتوں میں سامنے آئے ایک کلکتہ کا حسن ظاہر دوسرا اس کا رنگ باطن دونوں ہی میں شدت تاثر ہے۔ کلکتہ کے حسن ظاہر کے بارے میں کہا۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہف غضب

وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ ہف نظر

طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ وشیریں کہ واہ وا

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اور اسی کلکتہ کے بارے میں تلخیوں کا اظہار :۔

حال کلکتہ باز جستم وگفت

باید اقلیم ہشتمش گفتن

گفت اینجا چہ کار سود دہد

گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

گفت از بہر داد آمدہ ام

گفت بگریز و سر بسنگ مزن

اسی ذیل میں کچھ اور شہروں کا بھی ذکر آجاتا ہے :۔

گفت اکنوں بگو کہ دھلی چیست

گفت جان است واین جہانش تن

گفتمش چیست این بنارس گفت

شاہدے مست محو گل چیدن

گفتمش چون بود عظیم آباد

گفت رنگیں تر از فضائے چمن

دھلی کے بارے میں اگرچہ کوئی علاحدہ قطعہ موجود نہیں لیکن وہ وطن ہے اس کو کائنات کی جان قرار دینا محل عجب نہیں۔ دھلی سے تعلق خاطر کا نمایاں ثبوت نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے مدحیہ قصیدہ میں ملتا ہے لیکن یہ بھی ضمناً ہے۔ مستقل موضوع نہیں :

تانباشدلے ترک وطن نتواں کر

مشکلے درنظر آوردم وآساں زمم

چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخون

خود گواہم کہ ز دھلی بچہ عنوان زمم

اضطراب آئینہ پرداز جلاے وطن است

نہ بدل زمم ازاں بقعہ بل از جان زمم

لیکن یہ صرف بنارس ہے جس نے غالب کے دل سے وطن کو بھی بھلادیا ہے۔ مثنوی کا آغاز اگرچہ پریشانی خاطر اور شکایت احباب سے ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت چند ابتدائی اشعار تک ہے۔

شکایت گونۂ دارم زاحباب

کتانِ خویش می شویم زمہتاب

درآتش ازنوائے سازخویشم

کباب شعلۂ آواز خویشم

نفس ابریشم ساز فغان است

بسان نے تہم دراستخوان است

"کتان خویش می شویم زمہتاب" کا تمثیلی حسن اور "کباب شعلۂ آواز خویشم"، میں جذبہ کی جو فراوانی ہے 'اس کی تشریح ممکن نہیں۔ اگلے چند اشعار میں مخصوص احباب کے نام لے کر اک خاص درد و کرب کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان اشعار کو صرف فن ہی کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ انسانی خلوص اور دوستی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانوں کے ربط باہم کی قدریں متعین ہوسکتی ہیں۔

زار باب وطن جویم سہ تن را

کہ رنگ و روغن اند این نہ چمن را

چو خود را جلوہ گاہ ناز خواہم
ہم از حق فضل حق را باز خواہم
چو حرز بازوے ایمان نویسم
حسام الدین حیدر خان نویسم
چو پیوند قبائے جاں طرازم
امین الدین احمد خاں طرازم
گرشم از جہاں آباد رخم
مرایشاں را چرا از یاد رخم
جہاں آباد گر نبود الم نیست
جہاں آباد بادا جاے کم نیست

ہر سہ احباب میں سے ہر ایک کا مقام اس کے کسی امتیاز سے وابستہ ہے۔ حفظ مراتب اک اخلاقی فریضہ ہے اس لئے درجہ بندی اور مرتبہ شناسی کے علاوہ ان اشعار میں ایک فنی اہتمام یہ ہے کہ چونکہ شاعر کو آگے چل کر حسن بنارس کی منظر کشی کرنی ہے اس لئے گریز کا یہ خوبصورت انداز اختیار کیا گیا ہے۔

جہاں آباد گر نبود الم نیست
جہاں آباد بادا جاے کم نیست

اس شعر کے بعد گریز مکمل ہو جاتا ہے۔ طبع شاعر کا انقباض دور اور دماغ پوری طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ فکر و نظر پر رنگینیوں کا پرتو پڑتا ہے۔

بخاطر دارم اینک گل زمینے
بہار آئیں سواد دل نشینے
کہ می آید بدعوی گاہ لافش
جہاں آباد از بہر طوافش

نظرا دعوی گلشن ادائی
ازان خرم بہار آشنائی
سخن را نازش مینو تماشی
زگلبانگ ستائش ہائے کاشی
تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم وفردوس معمور
بنارس را کسے گفتہ کہ چین است
ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
بخود بڑکاری طرز وجودش
زدھلی می رسد ہر دم درودش

"بہشت خرم،، اور "فردوس معمور،، دوایسی اچھوتی اور دل آویز ترکیبیں ہیں جو معانی کی پہنائی کے اعتبار سے کئی طویل اور اثر انگیز نظموں سے بھی زیادہ شعریت انگیز ہیں۔ مذکورہ تعارفی اشعار بظاہر مبالغہ پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن جس دقت فکر اور جوش ادا کے ساتھ یہ شعر وجود میں لائے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا تاثر رواجی، وقتی یا ہنگامی قسم کا نہیں بلکہ قلب کی گہرائی سے نکلی ہوئی وہ بے اختیار داد ہے جو پیش نظر ماحول کو عالم سرخوشی میں دی گئی ہے۔ مرزا کے تاثرات کا اندازہ منیر لاہوری کی نظم "حسن بنگال،، سے کیجئے جس نے اپنے نزدیک سادگی اور پرکاری کا ایک دلکش مرقع پیش کیا ہے۔ لیکن وہ فنی نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی مرزا کے حسن نگارش کا ہمسر نہیں۔ منیر لاہوری کہتا ہے :

رسیدم چوں بہ فیض لایزالی
بہ بنگالہ پے عشرت سگالی
بہشتے دیدم ازگلہا نگارین
گلش چون دیدۂ حیران نگارین
بہر جا کا اندرین کشور رسیدم
بغیر از سنبل و ریحان نہ دیدم
بہ گلگشت چمن سرمست بادہ
چو گل آیند گلرویاں پیادہ
بہر جاے کہ بینی سبزہ زاراست
بہارست و بہارست و بہاراست

منیر نے چوتھے شعر میں منظر کشی کا حق ادا کر دیا ہے دوسرے مصرعہ میں تکرار نے جو نغمگی پیدا کی ہے وہ قاری کو بنگال کے سبزہ زاروں میں پہنچا دیتی ہے لیکن غالب[1] کی منظر نگاری میں معنویت اور استعارہ کی ندرت ایسی خوبیاں ہیں جو اسے بدرجۂ اتم ممتاز ٹھہراتی ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اس کے امتیاز کا مزید اظہار ہوتا ہے۔

خس و خارش گلستان است گوئی
غبارش گوہر جان است گوئی
دریں دیرینہ دیرستان نیرنگ
بہارش ایمن است از گردش رنگ
چہ فروردیں چہ دیماہ وچہ مرداد
بہر موسم فضائش جنت آباد
بہاراں در شتا وصیف ز آفاق
بکاشی می کند تشلاق و ییلاق

بوددر عرض بال انسانی ناز
خزانش صندل پیشانی ناز
بہ تسلیم ہوائے آں چمن زار
زموج گل بہاراں بستہ زنار
فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست
پس ایں رنگینی موج شفق چیست
سوادش پائے تخت بت پرستاں
سراپایش زیارتگاہ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیان است
ہمانا کعبۂ ہندوستان است

غبار کو گوہر جاں قرار دینا' بہار کو گردش رنگ سے محفوظ ٹھہرانا' خزاں کو پیشانی ناز کا صندل بتانا' بہاروں کو موج گل کے زنار پہنانا' رنگینی شفق کو قشقہ جبیں سے تعبیر کرنا' سراپا کو زیارتگاہ مستان اور عبادت خانہ ناقوسیان قرار دے کر کعبہ ہندوستان بتانا' شوخی فکر، احساس جمال، حسن ادا، اور زور بیان کے ایسے دلکش نمونے ہیں جنہیں سحر کاری ہی کہا جاسکتا ہے۔ لب گنگ کا نظارہ شاعر کو ہر نظارہ سے زیادہ محبوب ہے۔

زبس عرض تمنا می کند گنگ
زموج آغوشہا وا می کند گنگ
زتاب جلوہ ہا بیتاب گشتہ
گہرہا درصدف ہا آب گشتہ
بناز عکس روے آں پری چہر
فلک ورزد گرفت آئینہ از مہر

بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شد
بنارس خود نظیر خویشتن شد
بہ چین نبود نگارستاں چو اوئی
بگیتی نیست شارستاں چو اوئی
بیاباں در بیاباں لالہ زارش
گلستاں در گلستاں نوبہارش

دریا موجوں کے آغوش کھول کر عرض تمنا کرتا ہے۔ بنارس ایک محبوب ہے جو صبح وشام گنگا کے آئینہ میں اپنا حسن دیکھتا ہے اور جب دریا میں شہر کا عکس پڑا تو بنارس اپنی نظیر آپ ہوگیا، نظم کے یہ ایسے دلکش اور لطیف پیرائے ہیں جو قاری کو اچانک اک ایسی جنت ارضی میں پہنچا دیتے ہیں جو شاعر کے تصورات کو رنگین بنائے ہوئے ہے۔ منظر جتنا جتنا واضح ہوتا جاتا ہے، بنارس کا تصور بھی حسین سے حسین تر ہوتا جاتا ہے۔

قدسی نے اکبر آباد کو اپنی نظم میں رشک ارم قرار دیا ہے اور خوبان اکبر آباد کا ذکر چٹ خارے لے لے کر کیا ہے۔ اس کے ذیل کے اشعار تقابلی حیثیت سے لایق مطالعہ ہیں۔

بہ ملک دگر خاطرم شاد نیست
بہشتے بہ از اکبر آباد نیست
دریں گلشن عیش و دار سرور
بہر گوشۂ جوش غلمان و حور
زسبزان شیریں شمائل مپرس
لب پر نمک بین و از دل مپرس
چو سنبل ہمہ موکشاں پیچ پیچ
کمرہیچ و دلہا گرفتار ہیچ

شکر خندہ عام و دہن ناپدید

جہان نمک بے نمکداں کہ دید

بلاشبہ "لب پر نمک بین واز دل مپرس" کا جواب نہیں۔ یہ شوخی اور برجستگی شعر کی جان ہے لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ "کمر ہیچ و دلہا گرفتار ہیچ،، یا "شکر خندہ عام و دہن ناپدید،، میں کمر اور دہن کو ناپدید بتانا قدیم رواجی مبالغہ کی بنیاد پر فن کا کتنا ہی اچھا نمونہ ہو واقعیت اور حقیقت سے بمرحلہ دور ہے اور اسی لئے اس شدت تاثر سے محروم ہے' جسے بروئے کار لانے میں مرزا کا کوئی مقابل نہیں۔ غالب جب بتان بنارس کا ذکر تا ہے تو ان کے دہن اور کمر کی موجودگی واضح طور پر محسوس کرتا ہے اور یہ وہ اثر آفرینی ہے جسے محسوس ہی کیا جاسکتا ہے' بیان نہیں کیا جاسکتا۔ زبان غالب سے خوبان بنارس کا ذکر رنگیں سنئے۔

بتانش را ہیولی شعلہ طور

سراپا نور ایزد چشم بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا

زنادانی بکار خویش دانا

تبسم بسکہ درلب ہا طبیعی است

دہن ہارشک گلہائے ربیعی است

خرامے صد قیامت فتنہ دربار

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار

بہ لطف از موج گوہر نرم روتر

بہ ناز از خون عاشق گرم روتر

زانگیز قد انداز خرامے

بپائے گلبنے گسترده دامے

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرہوش

بہار بستر و نوروز آغوش

زتاب جلوۂ خویش آتش افروز

بتان بت پرست وبرہمن سوز

بسامان دو عالم گلستاں رنگ

بہ تاب رخ چراغان لب گنگ

قیامت قامتاں مژگاں درازاں

زمژگاں برصف دل نیزہ بازان

کیسا جیتا جاگتا ماحول ہے' چند حسین ہیں جن کے جسم شعلہ طور کی مثل ہیں' کمر نازک ہے دل قوی ہیں جو کار دلربائی میں ہوشیار ہیں۔ اگرچہ بھولی بھالی ہیں جن کے لبوں پر تبسم فطری اور مستقل ہے' جن کے دہن رشک گل اور رفتار فتنۂ محشر جگانے والی ہے' جو سبک روی میں موج گوہر سے بھی زیادہ نرم رو اور خرام ناز میں خون عاشق سے بھی زیادہ تیز رو ہیں۔ جب اٹھلا کر چلتے ہیں تو گلپوش جال بچھاتے جاتے ہیں جو "بہار بستر،، اور "نوروز آغوش" ہیں' اپنے جلوؤں سے آگ روشن کرتے ہیں اور اس سے برہموں کو جلاتے ہیں' جن کے روے رنگین کی روشنی سے لب گنگ چراغاں ہو جاتا ہے۔ اس منظر کشی سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ساری کائنات حسن ونور صرف ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہے اور شاعر اس کے نظاروں میں کھو گیا ہے' اس کی طبیعت کا جوش اور والہیت تیز تر ہو چکی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ آسمان سے تارے توڑ لائے اور وہ کچھ کہے جو اس سے پہلے کبھی نہ کہا گیا ہو اور آئندہ بھی نہ کہا جاسکے' اس کا فیصلہ ذوق سلیم ہی کر سکتا ہے کہ شاعر اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے "زتاب رخ چراغاں لب گنگ،، منظر کشی کا حرف آخر ہے مذکورہ اشعار میں فعلی کیفیت بہت کم ہے اور ارباب فن جانتے ہیں کہ جب حرف مطلب بغیر فعل کے سہارے برجستگی سے ادا ہوتا ہے تو کیسا مزا دیتا ہے۔

طالبؔ آملی جب لاہور سے قندھار جانے لگا تو اس نے حسینان لاہور و دھلی کے بارے میں اپنے رنگیں تصورات یک گونہ واقعہ نگاری کے انداز میں نظم کئے ہیں۔

نگاران لاہور و خوبان دھلی
بہ دل کردہ بودند پیوند جانم
گرہ بستہ بودند ہریک بہ نوعے
سررشتۂ جاں بموے میانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم
یکے بوسہ دادے بزلف عنانم
نشاندے یکے دربغل یاسمینم
نہادے یکے دردہاں برگ پانم

واقعہ نگاری کا یہ انداز بھی خاصا کیفیت انگیز ہے لیکن مرزا کی ثقاہت اس قسم کے واقعات پسند نہیں کرتی' وہ نازنینان بنارس کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ گویا وہ اس دنیا کی نہیں عالم بالا کی مخلوق ہیں۔

بیااے غافل از کیفیت ناز
نگاہے بر پریزادنش انداز
ہمہ جاں ہاے بے تن کن تماشا
نہ دارد آب وگل ایں جلوہ حاشا
نہادشان چو بوے گل گراں نیست
ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست

مرزا کے محبوب کی نزاکت بار جسد کی متحمل نہیں' خاک کے پتلوں میں یہ جلوے کہاں؟ وہ تو پھول کی خوشبو کی طرح سبک ہیں یا ایسی جانیں ہیں جن کا کوئی جسم نہیں' پاکیزگی اور لطافت کا یہ وہ تصور ہے جس کے بعد پرواز خیال ختم ہو جاتی ہے اور اس ماحول میں۔

تناغ مشرباں چوں لب کشایند
بہ کیش خویش کافی راستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بہ میرد
دگر پیوند جسمانے نہ گیرد
بہ تن سرمایہ افزائش دل
سراپا مژدۂ آسائش دل
بہ مستی موج رافرمودہ آرام
زلغزے آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورشے در قالب آب
زماہے صد دلش در سینہ بے تاب

مرزا کا امتیاز یہ ہے کہ پوری مثنوی میں زور بیان یکسانیت کے ساتھ برقرار ہے۔ دوسرے شعرا کے یہاں دو چار شعر ہی لائق توجہ ہوتے ہیں۔ غنیمت کنجاہی کے اشعار ذیل دیکھئے:

ندیدم کشور ے غارتگر تاب
بخوبی ہاے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بہ خاکش آب کوثر
بتانش چوں ز روے مہر جوشند
شکر گویند و گوہر می فروشند
بہ ہر شہرش بتان گرم بازار
پئے سودا دل عاشق خریدار

مذکورہ شعرا کے کلام سے واضح ہے کہ حقیقت پسندی، معانی آفرینی، شوخی اور

بے ساختگی میں مرزا کا مقام منفرد ہے۔ مثنوی میں منظر کی دلکش عکاسی کے بعد نفس مضمون کی منزل آتی ہے۔ ایک رات شاعر نے کسی پیر روشن ضمیر سے بے مہری زمانہ کا شکوہ کرتے ہوئے اس بات پر اظہار حیرت کیا ہے کہ ایسے ہنگامہ خیز حالات میں قیامت کیوں نہیں آجاتی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شبے پرسیدم از روشن بیانے
زگردش ہائے گردوں راز دانے
کہ بینی نیکوئیہا از جہاں رفت
وفا و مہر و آزرم از میاں رفت
پدرہا تشنۂ خون پسرہا
پسرہا دشمن جان پدرہا
برادر با برادر در ستیز است
وفاق از شش جہت رو در گریز است
بدین بے پردگیہائے علامت
چرا پیدا نمی گردد قیامت

پیر روشن ضمیر نے اس شکایت کا جو جواب دیا ہے وہ شاعر کے علوے فکر کا شاہکار ہے۔ اس کے اس پیغام میں فلسفیانہ موشگافی، معنویت، جوش اور تاثیر سبھی کچھ موجود ہے۔ شاعر نے ایک دور رس فلسفی کی طرح یہ واضح کر دیا ہے کہ انسانی نفس کی پنہاں طاقتیں جن کا اسے ادراک و احساس نہیں ہے 'لامحدود ہیں اور اگر انسان ان پنہاں طاقتوں کو بروے کار لے آئے اور تکمیل مقاصد کی خواہش کو بحد جنون پہنچادے تو فتح و کامرانی اس کے قدم چوم سکتی ہے اور امر واقعہ بھی یہ ہے کہ انسان کی کامیابی خود اسی کے عزم محکم اور صدق یقین میں پنہاں ہے۔ جب مقصد بحد جنوں پہنچ جائے تو خارجی موانعات بالکل بے اثر اور بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ اس محل پر پیر روشن ضمیر کا جواب سنئے 'غالب کی فنی صلاحیت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

سوئے کاشی بانداز اشارت

تبسم کرد و گفتا این عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا

کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

بلند افتادہ تمکین بنارس

بود براوج اواندیشہ نارس

الاائے غالبؔ کار اوفتادہ

زچشم یار و اغیار اوفتادہ

چہ جوئی جلوہ زیں رنگیں چمن ہا

بہشت خویش شواز خوں شدن ہا

جنونت گر بنفس خود تمام است

زکاشی تابہ کاشاں نیم گام است

"بہشت خویش شواز خوں شدن ہا،، میں عظیم فلسفہ پوشیدہ ہے اور آخری شعر میں تو خاص طور پر وہ راز منکشف کر دیا گیا ہے جسے صحیح معنی میں راز حیات کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا غالباً کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال کی خودی کی ابتدا غالبؔ کے اسی شعر سے ہوتی ہے۔ فلسفہ اگرچہ غالبؔ کی اردو شاعری میں بھی رچا بسا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ مثنوی کے چند آخری اشعار میں غالب نے جس فلسفیانہ رمزیت اور اشاریت سے کام لیا ہے اس کا جواب اردو میں موجود نہیں۔ غالب کے نزدیک دنیائے امکان میں امکانات کی لامحدود پہنائیاں ہیں۔ الفاظ وعبارت میں ان کا احصا ممکن نہیں۔ مقصد کا تعین اور حصول مقصد کے لئے "جنوں،، ایک ایسا تیر بہ ہدف نسخہ ہے جو زندگی کے تمام امراض کا قطعی اور شافی علاج ہے۔

چو بوے گل زپیراہن برون آ

بہ آزادی زبندتن برون آ

مدہ ازکف طریق معرفت را
سرت گردم بگرداین شش جہت را
بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر
دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
از آنانت تغافل خوشنما نیست
بداغ شان ہوائے گل روانیست
ترا اے بے خبر کاریست درپیش
بیابانے وکہساریست درپیش
جو سیلابت شتاباں می تواں رفت
بیاباں دربیاباں می تواں رفت
تر ازاندوہ مجنوں بود باید
خراب کوہ و ہاموں بود باید
تن آسانی بتاراج فنا دہ
چوبینی رنج خود را رونما دہ
ہوس را سربالین فنا نہ
نفس را ازدل آتش زیر پا نہ
دل از تاب بلا بگداز وخون کن
زدانش کارنکشاید جنوں کن
نفس تا خود فرونشیند از پا
دمے ازجادہ پیمائی میاسا
شرار آسا فنا آمادہ بر خیز
بیفشاں دامن و آزادہ بر خیز

ز الا دم زن وتسلیم لا شو
بگواللہ وبرق ما سوا شو

مذکورہ اشعار اس مقام بلند کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں شاعری جزو پیغمبری قرار پاتی ہے اگر یہ صحیح ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں شاعر کے پیغام کا بھی بڑا دخل رہا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ پیغام زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے یہ پیغام جہد مسلسل اور عمل پیہم کا پیغام ایک فیصلہ کن نظریہ ہے جو انسان کو بیم ورجا کی منزل سے نکال کر یقین واعتماد کی سرحد تک لے جاتا ہے "زدانش کار نکشاید جنوں کن" میں مصائب حیات کا آخری حل موجود ہے۔ غالب کے نزدیک عقل ودانش کی رہنمائی محدود ہے اور جنوں ہی وہ آخری رہنما ہے جو عروس کامیابی سے ہمکنار کرا سکتا ہے۔ وہ تن آسانی کو جرم ٹھہراتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ۔

نفس تا خود ننشیند از پا
دلے از جادہ پیمائی میاسا

معلوم ہوتا ہے شاعر نے نفس انسانی کی بے پناہ صلاحیت کار کا جائزہ لیا ہے اس کے تجربات ومشاہدات نے اس کو وہ خود اعتمادی بخشی ہے جو اسے یہ نعرہ لگانے پر مجبور کرتی ہے کہ۔

شرار آسافنا آمادہ برخیز
بیفشاں دامن و آزادہ برخیز

کارزار حیات کے ہر مرحلہ پر اور انفرادی یا اجتماعی زندگی کے ہر موڑ پر یہ پیغام رجز کا کام دیتا ہے۔ وہ حرکت کو زندگی اور سکون وقرار کو موت ٹھہراتا ہے' اس کا مشورہ یہ ہے۔

تن آسانی بتاراج فنا دہ
چوبنی رنج خود را رونما دہ
ہوس را سر بہ بالین فنا نہ
نفس را از دل آتش زیر پا نہ

غالبؔ نے اس مثنوی میں جو جلیل القدر نظریہ پیش کیا ہے اس کا اردو کلام اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے' قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پیغام کی اہمیت کو سب سے پہلے اقبال نے محسوس کیا اور اتنا محسوس کیا کہ اس کا انداز فکر کلیتاً اسی رنگ میں ڈھل گیا اقبال کا بیشتر کلام جو دانش وجنوں کے مدارج کا تعین کرتا ہے' غالب کے نظریہ کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی کا آخری شعر اس کے پیغام کا بھی حرف آخر ہے۔

ز الا دم زن و تسلیم لا شو
بگو اللہ و برق ماسوا شو

زندگی کی وہ حرارت جس سے منزل حیات طے کی جاتی ہے' وہ سوز نفس ہر حصول مقصد کی راہ میں تمام خارجی موانعات کو خس وخاشاک کی طرح جلا کر خاکستر بنا دیتا ہے' جو خود ایک مقصد ہے اور حصول مقصد کا ذریعہ بھی' اسی نقطہ نظر کا بین ثبت ہے "بگو اللہ و برق ماسوا شو"، میں وہ نوید کامرانی مضمر ہے جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے سرگرداں ہے۔

قصائد

مرزا نے نعت و منقبت کے علاوہ مداحی کا کار نامطبوع خوشی خاطر سے نہیں معاشی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا۔ وہ جس خوشحال اور باعزت خاندان کے پروردہ تھے' اس کی سماجی روایات کا سنبھالنا ان کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ ذریعہ معاش پنشن تھی جو خطرہ میں پڑ چکی تھی اس کی بازیابی کے بغیر سماج میں عزت سے جینا مشکل تھا۔ شاعری کی ہر صنف میں انھوں نے انحراف سے کام لیا اور روایت شکنی کی لیکن

مدح سرائی کے معاملہ میں ان شعرائے سلف کی پیروی کی جو دربار سے وابستہ تھے اور قصیدہ نگاری ان کا پیشہ بن چکی تھی۔ ان کے عہد تک سماج میں اس آزادی فکر کی گنجائش بھی نہ تھی جس کی روشنی میں ہم ان کے کارمداحی کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور اس ماحول سے صرف نظر کر لیتے ہیں جس میں مرزا سانس لے رہے تھے۔ بہر حال مرزا نے قصیدہ نگاری کی اور تقریباً ۶۴ قصیدے لکھے اور ان میں اپنی علوئے فکر کے نقوش مرتسم کئے، تشبیوں کو مقصد و معنویت سے آراستہ کیا۔ جو مفاہیم غزل کے دامن تنگ میں نہ سما سکتے تھے انہیں تشبیوں کے دامن فراخ میں پورے جمال فن کے ساتھ سمویا اور بنام مدح بھی اپنے ذوق اور فن کا معیار کم نہ ہونے دیا۔ ہر قصیدہ میں ان کی انفرادیت کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے یعنی تشبیب طویل اور مدح مختصر و محدود۔ من جملہ ۶۴ قصیدوں کے بارہ انکی اپنی عقیدت پر مبنی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ "رند مشربی،، اور عرفان حق میں ہنوز فاصلہ تو ہے مگر بنیاد میں کوئی خرابی نہیں۔ کلیات فارسی کا اولین قصیدہ بعنوان "توحید،، ہے جو عرفی کی زمین میں ہے۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ
گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

(عرفؔی)

اے زوہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے وخود را در گماں انداختہ

(غالبؔ)

یہ مطلع بنظر انصاف دیکھا جائے تو عرفی کے مطلع سے اگر برتر نہیں تو معنوی حیثیت سے کمتر بھی نہیں۔ ذیل میں مذکورہ قصیدہ کے علاوہ بقیہ چودہ قصیدوں کے پُر شکوہ مطلع پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ ان سے پورے قصیدہ کے معیار کا اندازہ کیا جا سکے، تمام قصائد اور ان کے محاسن کا بار یہ کتاب نہیں اٹھا سکتی، جہاں تک نعت کا تعلق ہے مرزا کی وہ

غزل جس کا مقطع ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

نعت میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلا شبہ یزداں کے علاوہ کوئی بھی محمدؐ کا صحیح مرتبہ داں نہیں۔ نعتیہ قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو۔

آں بلبلم کہ درچمنستان شاخسار
بود آشیان من شکن طرۂ بہار
مرادلے است پس از کوچہ گرفتاری
کشادہ روئے ترا زشاہدان بازاری

نعت ومنقبت میں مشترک

چوں تازہ کنم در سخن آئین بیاں را
آواز دہم شیوا بیاں ہم نفساں را

منقبت در مدح مولائے کائنات علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔

صبحے کہ درہوائے پرستاری وثن
جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن

ایضاً

نازم بہ گراں مایگی دل کہ زسودا
ہر قطرہ خوں یافتہ پرواز سویدا

ایضاً

خواہم کہ ہمچو نالہ زدل سر بر آورم
دود از خود و شرارہ ز آزر بر آورم

دوش آمد وبوسہ لبم بردہاں نہاد
راز دہان خویش بلب درمیاں نہاد

درمدح سید الشہد اامام حسین علیہ السلام

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد
کہ ظلمتش دہد از گور اہل عصیاں یاد

ایضاً

ابر اشکبار و ماخجل از ناگریستن
دارد تفاوت آب شدن تاگریستن

درمدح امام آخر الزماں امام دوازدہم

ہست از تمیز گربہ ہما استخواں دہد
آئین دہر نیست کہ کس رازیاں دہد

درمدح حضرت عباس علمدار لشکر حسینی

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را

مرثیہ

اصناف سخن میں مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جسے شوخ طبع شاعر نے نہیں اپنایا لیکن رثائیت کا پتہ ان قطعات میں ملتا ہے جو بعنوان نوحہ لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تین قصیدے بھی جو سید الشہدا امام حسین علیہ السلام اور حضرت عباس ابن علی کی مدح میں ہیں' تاثر کے اعتبار سے مرثیہ ہی کے قائم مقام ہیں۔ "گریستن،، کی زمین کا قصیدہ جو امام سوئم کی مدح میں ہے ایک حیثیت سے مرثیہ ہی ہے اگرچہ آئین مرثیہ کے مطابق بصورت مسدس نہیں' مرثیہ ذریعۂ اظہار غم ہے وہ کسی بھی پیرایہ میں ہو سکتا ہے۔

کچھ کلیات فارسی کے بارے میں

کلیات کا پہلا نام جو خود مرزا نے تجویز کیا تھا "میخانۂ آرزو،، تھا یہ ۱۸۳۸ء میں مرتب ہو چکا تھا لیکن ۱۸۴۵ء میں پہلی بار مطبع دار السلام دھلی سے طبع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خان نے اسے "کلیات غالب فارسی،، کے نام سے مطبع نول کشور لکھنو سے طبع کرایا۔ اس مطبع سے اور بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع ہوا لیکن ہندوستان میں چونکہ اس کی طلب نہیں اس لئے کسی پبلشر نے اسے شائع کرنے کی ہمت نہیں کی' مارکیٹ میں پرانا نسخہ بھی اب کمیاب ہے۔ (کلیات کے اشعار کی کل تعداد تقریباً ساڑھے دس ہزار ہے) جس میں غزلیات ۲۵۰، قصائد ۶۴، مثنویاں ۱۱، قطعات ۶۶، رباعیاں ۱۴۰، مخمس ۱، ترجیع بند ۱، ترکیب بند ۳، ان کے علاوہ مغنی نامہ' ساقی نامہ' نوحے اور سلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔

مرزا غالب اور آم

آم مرزا کا مرغوب ترین پھل تھا۔ اُردو میں ان کے لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں۔

ایک مثنوی در مدح انبہ بھی ان کے ذوق انبہ کی آئینہ دار ہے لیکن فارسی زبان میں ان کا ایک

خط جو مرزا کے قیام کلکتہ کے دوران عزاخانہ ہگلی بندر کے متولی صاحب کے نام لکھا گیا ان کے حسن نگارش اور حسن طلب کا دل آویز ثبوت ہے۔

لکھتے شکم بندہ ام وقدرے ناتواں' ہم آرائش خوان جویم وہمہ آرسایش جان خردمنداں دانند کہ ایں ہر دوصفت بہ انبہ است واہل کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی گل از گلشن ایثار از جناب وسپاس از من شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دوسہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گزشت و آزمی نالد کہ حاشا بدین "مایہ بر خورداری،، خورسند نہ خواہم گشت میں کچھ پیٹ کا بورا بھی ہوں اور کچھ کمزور بھی' آرائش خواں و آسایش جاں کا متلاشی ہوں۔ ارباب خرد جانتے ہیں کہ یہ صفتیں آم سے تعلق رکھتی ہیں اور اہل کلکتہ بندرگاہ ہگلی کو قلمرو انبہ سمجھتے ہیں' ٹھیک ہے آم گلی سے پھول گلشن سے ایثار جناب سے اور تشکر خاکسار سے' شوق کا تقاضا ہے کہ موسم کے آخر تک میں دو یا تین بار خاطر ولی نعمت سے گزرتا رہوں' حرص اشکبار ہے کہ حاشا میں اس "مایہ برخورداری،، سے خوش نہ ہونگا۔ (مایہ برخورداری بچوں کو بہلانے والی تعداد)۔ اس خط کے علاوہ ان کا ایک فارسی شعر بھی قابل ذکر ہے۔

گر ہمہ میوۂ فردوس بخوانت باشد

غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

حسن اتفاق دیکھئے کہ اگر مرزا کی فکر معنویت اور اسلوب وادا کی عام طور پر تقلید کرنے کی کوشش کی گئی اور فن میں ان کی روایت شکنی کا چلن عام ہوا تو ان کے ذوق انبہ کی پیروی بھی ان قابل احترام بزرگوں نے کی جنہوں نے ادب میں اپنے رنگ و آہنگ کی شناخت قائم کی۔ اس ذیل میں اقبال، اکبرالہ آبادی، حالی، سرسید، خواجہ حسن نظامی، داغ دھلوی کے نام قابل ذکر ہیں اور مرزا سے پہلے ان کے پیرومرشد بیدل ہیں جنہوں نے اپنے عقیدت مند شکر اللہ خان صاحب کے تحفۂ انبہ کے جواب میں بطور تشکر چند فارسی اشعار لکھ بھیجے اور آموں کے تعلق سے سہارنپور کا نام بھی تاریخ میں رقم ہوا۔

(نوٹ) : سید صفدر حسن کے دادا سید علی احمد مشاہیر روزگار اور دانایان وقت سے تھے علم سے بہرۂ وافر رکھتے تھے' ان کے فرزند الٰہی بخش جو بہ عہدۂ دفعہ داری سر فراز تھے' ۱۲۳۳ھ میں فوت ہو گئے۔ ایک پسر دس سال کا سید علی بخش نامی یادگار چھوڑا سید علی احمد نے 'فرزند متوفی کی جگہ اپنے پوتے سید صفدر حسن کو وارث قرار دیا' صفدر حسن استعداد علمی و عملی درست کر کے متاہل نہ ہوئے تھے کہ فوت ہو گئے' یہ نقوی مودودی خاندان سادات امروہہ کے ایک لایق فرد تھے۔ تھۂ التواریخ مطبوعہ ۱۲۹۱ صفحہ ۳۰۔

راقم کا یہ مضمون ماہنامہ آج کل' نئی دہلی' شمارہ مارچ ۱۹۶۳ء (ص ۴۹۔۱۰) میں شایع ہوا ہے۔

ترکیب بند

خواہم از بند بہ زندان سخن آغاز کنم
غمِ دل پردہ‌دری کرد ، فغان ساز کنم

بہ‌نوائے کہ زمضراب چکانند خوناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

در خرابی بہ جہان میکدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعویِ اعجاز کنم

بے مشقت نبود قید ، بہ شعر آویزم
روزکے چند رسن‌تابیِ آواز کنم

چون سرایم سخن ، انصاف ز مجرم خواہم
چون نویسم غزل ، اندیشہ ز غماز کنم

تا چہ افسون بہ‌خود از ہیبتِ صیاد دمم
تا چہ خون در جگر از حسرتِ پرواز کنم

یہ شاہکار نظم جو غالب کی ''قید فرنگ'' کے نثی حاصلات میں سے ہے ، ان کے ایام اسیری (۱) میں (یعنی اواخر ماہ مئی اور اواخر ماہ ستمبر ۱۹۴۷ع کے درمیان (۲) وجود پذیر ہوئی ، جیسا
(جاری)

یارِ دیرینہ قدم‌رنجہ سفرما کاینجا
آن نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

ہاے ناسازی طالع کہ بہ‌من گردد باز
با خرد شکوہ گر از طالع ناساز کنم

اہلِ زندان بہ سر و چشمِ خودم جا دادند
تا بدین صدرنشینی چہ‌قدر ناز کنم

بلہ دزداں گرفتار ، وفا نیست بہ‌شہر
خویشتن را بہ‌شہا ہمدم و ہمراز کنم

من گرفتارم و این دایرہ دوزخ ، تن زن
در سخن پیرویِ شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقیعِ گرفتاری جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشدلی امیدم نیست

کہ خارجی اور داخلی شواہد سے ثابت ہے - اس نظم کا تعارف سب سے پہلے خواجہ حالی نے کرایا اور اس کو اپنے تبصرے اور انتخاب میں نمایاں حیثیت دی - (یادگار غالب ، ص ۲۳) - حالی نے اس
(جاری)

شمع ہر چند بہ ہر زاویہ آسان سوزد
خوشتر آنست کہ بر نطع در ایوان سوزد

عود من ہرزہ مسوزید ، وگر سوختنی ست
بگذارید کہ در مجمرِ سلطان سوزد

خانہ ام زاتشِ بیدادِ عدو سوخت ، دریغ
سوختن داشت ز شمعیکہ شبستان سوزد

منم آن خستہ کہ گر زخمِ جگر بنمایم
برمن از مہر دلِ گبر و مسلمان سوزد

منم آن سوختہ خرمن کہ ز افسانۂ من
نفسِ راہرو و رہزن و دہقان سوزد

منم آن قیس کہ گر سوی من آید لیلی
محمل از شعلۂ آوازِ حدی خوان سوزد

ترکیب بند کو غالب کی ''عمدہ ترین'' نظموں میں شمار کیا ہے ۔
جناب غلام رسول مہر کی رائے میں یہ غالب کی ''ایک بہترین نظم''
ہے ۔ ظ انصاری نے کہا ہے ''کلیات میں جو ۸۴ شعر کا ترکیب بند
(جاری)

تا چسانم گذرد روز بہ شبہا ، دریاب ،
از چراغے کہ عکس بردرِ زندان سوزد

تنم از بند در انبوہِ رقیبان ارزد
دلم از درد بر اندوہِ اسیران سوزد

از نمِ دیدۂ من فتنۂ طوفان خیزد
از تفِ نالۂ من جوہرِ کیوان سوزد

آہ ازین خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار
جزبدان خواب کہ در چشمِ نگہبان سوزد

آہ ازین خانہ کہ در وے نتوان یافت ہوا
جز سموے کہ خس و خارِ بیابان سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بہ‌چراغم شمری
دلم از سینہ برون آر کہ داغم شمری

انہوں نے لکھا وہ جاں و تن کی آزادی طلب کرنے والے شاعر کا ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں مشکل سے ملے گی - شیخ اکرام کا اندازہ ہے کہ پچھتر برس بعد
(جاری)

پاسبانان بہم آئید کہ من می آیم
درِ زندان بکشائید کہ من می آیم

ہر کہ دیدے ، بہ درِ خویش سپاسم گفتے
خیرِ مقدم بسرائید کہ من می آیم

جادہ نشناسم و زانبوہِ شما می ترسم
راہم از دور نمائید کہ من می آیم

رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکند
سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم

خست تن دررہ و تعذیب ضرور است اینجا
نمک آرید و بسائید کہ من می آیم

عارضِ خاک بہ پاشیدنِ خون تازہ کنید
رونقِ خانہ فزائید کہ من می آیم

اقبال نے مولانا محمد علی کی ''اسیری پر جو نظم لکھی اس پر غالب
کے اسی زندان نامے کی کیفیت طاری ہے ۔'' (غالب شناسی ،
ص ۲۷) ۔ مالک رام صاحب نے غالب کے اس ''اسیریے'' کو
(جاری)

چون من آیم بہشما، شکوۂ گردون نہ رواست
زین سپس ژاژ مخائید کہ من می آیم

ہان ، عزیزان کہ درین‌کلبہ اقامت دارید
بختِ خود را بستائید کہ من می آیم

تا بہ‌دروازۂ زندان پیِ آوردنِ من
قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم

چون سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است
بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

بہ‌خود از شوق ببالید کہ خود باز روید
بہ‌من از مہر گرائید کہ من می آیم

بسکہ خویشان شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من
غیر لشگفت خورد گر غمِ ناکامیِ من

''فارسی نظم کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ'' قرار دیا ہے (ذکر غالب ، ص ٦٤) ۔ غالب کی شخصیت اور فکر و فن کے مطالعے کے لیے ان کی اس شعری تخلیق کا مبسوط تنقیدی جائزہ بہت مفید

(جاری)

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی
آفتاب از جہتِ قبلہ برآمد گوئی

دل و دستے کہ مرا بود فروماند زکار
شب و روزے کہ مرا بود سر آمد گوئی

سرگذشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی
سر نوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی

بہرۂ اہلِ جہان چون ز جہان درد وغم است
بہرۂ من ز جہان بیشتر آمد گوئی

خستن و بستنِ من حدِ عسس نیست ، برو
برمن اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی

ہنرم را نتوان کرد بہ خستن ضائع
خستگی ، غازۂ رویِ ہنر آمد گوئی

ہو سکتا ہے ، اور غالب کی شاعری میں ایک نئے موڑ کا سراغ لگانے میں مدد دے سکتا ہے کہ کس طرح یہ حادثہ ''غازۂ روی ہنر'' ثابت ہوا ۔

(جاری)

غمِ دل داشتم اینک غمِ جانم دادند
زخم را زخمِ دگر بر اثر آمد گوئی

چرخ یک مردِ گرانمایہ بہزندان خواہد
یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گوئی

مژہ امشب زکجا اینہمہ خوناب آورد
اینچنین گرم ز زخمِ جگر آمد گوئی

خودچرا خون خورم از غم کہ بغمخواریِ من
رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجۂ ہست درین شہر کہ از پرسشِ وی
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خان کہ درین واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم ، چہ غم از مرگ ، عزا دارِ من است

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں : یادگار غالب ص ۲۲ ، غالب ، مہر ، آٹھواں باب ، مکاتیب غالب ، دیباچہ (ص ۱۷ حواشی) ، ذکر غالب ، ص ۲۶ ، آثار غالب ، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ، ص ۵۸ ،
(جاری)

خواجہ دانم کہ بسے روز نمانم در بند
لیک دانی کہ شب از روز ندانم در بند

نپسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم
جانبِ در بہ‌چہ‌حسرت نگرانم دربند

خستہ ام خستہ من و دعویِ تمکین حاشا
بند سخت است ، تپیدن نتوانم دربند

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

آمہ و خامہ بیارید و سجل بنویسید
خواب از بخت ہمی وام ستانم در بند

یا رب این گوہرِ معنی کہ فشانم ز کجاست
بند بردل بود و نیست زبانم در بند

ہندوستانی اخبار نویسی ، ص ۲۵۶ ، نیز جناب مرتضیٰ حسین کا مقالہ : غالب اور قید ، آج کل ، دہلی ، اپریل ۱۹۵۰ء ، گوپی چند صاحب نارنگ کا مقالہ : غالب اور حادثۂ اسیری ، نقوش ، لاہور ، اگست ۱۹۶۰ء

(جاری)

ہر کس از بندِ دران نالد و ناکس کہ منم
نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند

خوی ِ خوش بہر ِ مصیبت زدہ رنجے دگر است
رنجہ از دیدن ِ رنج ِ دگرانم در بند

رفتہ دربارہٴ من حکم کہ با درد و دریغ
شش مہ از عمرِ گرامی گذرانم در بند

اگر این است ، خود آنست کہ عیدِ اضحیٰ
گذرد نیز چو عیدِ رمضانم در بند

مدتِ قید اگر در نظرم نیست چرا
خون ِ دل از مژہ بےصرفہ چکانم در بند

نیستم طفل کہ در بندِ رہائی باشم
ہم ز ذوق است کہ در سلسلہ خائی باشم

---

(۲) غالب ، مہر ، ص ۱۸۷ ، حاشیہ -

من نہ آنم کہ ازین سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم چون بہ‌تقضا زہرہٗ جنگم نبود

زین دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی بظہور
گلہٗ نیست کہ از بختِ دو رنگم نبود

رازدانا غمِ رسوائیِ جاوید بلاست
بہرِ آزار غم از قیدِ فرنگم نبود

لرزم از خوف درین حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کامِ نہنگم نبود

زین دو سرہنگ کہ پویند بہم ، می ترسم
بیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود

منم آئینہ و این حادثہ زنگ است ولے
تابِ بدنامیِ آلایشِ زنگم نبود

اہ ازان دم کہ سرایند ز زندان آمد
اندرین دائرہ گیرم کہ درنگم نبود

ہمدمان ، داردم امیدِ رہائی در بند
دامن ار بعدِ رہائی تہِ سنگم نبود

جورِ اعدا رود از دل بہ‌رہائی ، لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود

بہ شگافِ قلم از سینہ برون می ریزد
بسکہ گنجائیِ غم در دلِ تنگم نبود

حاش للہ کہ درین سلسلہ باشم خوشنود
چہ کنم چون سرِ این رشتہ بہ‌چنگم نبود

بہ صریرِ قلمِ خویش بود مستیِ من
اندرین بندِ گران بین و سبکدستیِ من

ہمدمان ، در دلم از دیدہ نہانید ہمہ
غالبِ غمزدہ را روح و روانید ہمہ

للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ
للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ

ہم در آئینِ نظر سحرطرازید ہمہ
ہم در اقلیمِ سخن شاہ نشانید ہمہ

چشمِ بددور کہ فرخندہ لقائید ہمہ
شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ

سود بینید ، وفا دیدہ و نورید ہمہ
زندہ مانید ، صفا قالب و جانید ہمہ

من بہ خون خفتہ و بینم ، ہمہ بینید ہمہ
من جگرخستہ و دانم ، ہمہ دانید ہمہ

درمیان ضابطهٔ مہر و وفائے بود ست
من برینم کہ بر آئینہ برآئید ہمہ

روزے از مہر نگفتید فلانی چون است
بارے از لطف بگویید ، چسانید ہمہ

گر نباشم بہ‌جہان ، خار و خسے کم گیرید
اے کہ سرو و سمنِ باغِ جہالید ہمہ

چارۂ گر نتوان کرد ، دعائے کافی ست
دل اگر نیست خداوندِ زبانید ہمہ

ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام
بنویسیدو ببینید و بخوانید ہمہ

آن نباشم کہ بہ ہر بزم ز من یاد آرند
دارم امید کہ در بزمِ سخن یاد آرند